بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عظمت نہج البلاغہ

علامہ سید علی نقی نقوی نقن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

عرض ناشر

حمد ہے اس ذات کے لئے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا اور درود و سلام ہو اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جسے اس نے عالمین کے لئے سراپا رحمت بنا کر مبعوث فرمایا اور سلام و رحمت ہو ان کی آل پر جنہیں اس نے پورے جہاں کے لئے چراغ ہدایت بنایا۔

جب سے ادارہ قائم کیا ایک خواہش تھی کہ جناب سید علی نقی نقن رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں شائع کی جائیں لیکن مصروفیات کی بنا پر اس خواہش کی تکمیل میں تاخیر ہوئی۔ امید کہ انشاءاللہ تمام دستیاب کتب فراہم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سب معاونین کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ اوران کی اس سعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

مذکورہ کتاب دراصل جناب سید العلما حضرت علی نقی نقن کی وہ مقالہ ہے جس میں انہوں نے نہج البلاغہ پر اٹھائے گئے چند اعتراضات پر جوابات پیش کئے ہیں، یہ جوابات ہر اس شخص کے لئے کافی ہیں جس کا مقصد اصل حقائق تک رسائی ہے ڈھٹائی نہیں۔

زیر نظر کتاب کی اشاعت ہمارے لئے کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اسلامی تعلیمات کے فروغ اور دین الٰہی کی نشر و اشاعت کے لئے کام کر رہے ہیں، ہماری دعا ہے اللہ رب العزت تمام امت مسلمہ کو عزت و سربلندی عطا فرمائے اور ہم سب کو ہر طرح کی بداخلاقی اور دیگر آفات و بلیات سے محفوظ رکھے اور اپنی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی ادا کرنے کی

توفیق عنایت فرمائے۔(آمین)

علامہ علی نقی نقن کی تمام کتب جو معراج کمپنی سے شائع کی جارہی ہیں وہ اب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ **www.misbahulqruantrust.com** پر مطالعہ کے لئے پیش کی جارہی ہیں اللہ رب العزت ادارہ مذکورہ کے اراکین اور منتظمین کی توفیقات کی اضافہ فرمائے۔

ادارہ معراج کمپنی شیخ محمد باقر امین صاحب کی دادی مرحومہ کے نام پر قائم کیا گیا ہے۔ مومنین کرام سے درخواست ہے کہ مرحومہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا امر:

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاھرین

نہج البلاغہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام کا وہ مشہور ترین مجموعہ ہے جسے جناب سید رضی برادر شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ نے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مرتب فرمایا تھا۔

اس کے بعد پانچویں صدی کے پہلے عشرہ میں آپ کا انتقال ہو گیا ہے اور نہج البلاغہ کے انداز تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے طویل جستجو کے ساتھ درمیان میں خالی اوراق چھوڑ کر امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کو متفرق مقامات سے یکجا کیا تھا، جس میں ایک طویل مدت انہیں صرف ہوئی ہوگی اور اس میں اضافہ کا سلسلہ ان کے آخر عمر تک قائم رہا ہوگا۔

یہاں تک کہ بعض کلام جو کتاب کے یکجا ہونے کے بعد ملا ہے، اس کو تعجیل میں انہوں نے اس مقام کی تلاش کئے بغیر جہاں اسے درج ہونا چاہئے تھا، کسی اور مقام پر شامل کر دیا ہے اور وہاں پر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ کلام کسی اور روایت کے مطابق اس کے پہلے کہیں پر درج ہوا ہے۔ یہ انداز جمع و تالیف خود ایک غیر جانبدار شخص کے لئے یہ پتہ دینے کے واسطے کافی ہے کہ اس میں خود سید رضی کے ملکۂ انشا اور قوت تحریر کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ انہوں نے صرف مختلف مقامات سے جمع آوری کر کے امیر المومنین کے کلام کو یکجا کر دینے پر اکتفا کی ہے یہ پاشانی اور پریشانی جیسے بحیثیت تالیف کے کتاب کا ایک نقص

سمجھنا چاہئے ۔ مقام اعتبار میں اس پر اعتماد پیدا کرنے والا ایک جوہر ہوگیا ہے ۔ انہوں نے مختلف نسخوں اور مختلف راویوں کی یادداشت کے مطابق نقل الفاظ میں اتنی احتیاط کی ہے کہ بعض وقت دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہوجاتا ہے کہ اس عبارت کے نقل کرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا جبکہ ابھی ابھی ہم ایسی ہی عبارت پڑھ چکے ہیں جیسے ذم اہل بصرہ میں اس شہر کے غرقابی کے تذکرے میں اس کی مسجد کا نقشہ کھینچنے میں مختلف عبارات کبھی نعامۃ، جاثمۃ اور کبھی کجوء جوء طیر فی لجۃ بحر اوراس سے ملتے جلتے ہوئے اور الفاظ، یہ اسی طرح کا اہتمام صحت نقل میں ہے

جیسے موجودہ زمانہ میں اکثر کتابوں کی عکس تصویر شائع کی جاتی ہے جس میں اغلاط کتابت تک کی اصلاح نہیں کی جاتی اور صرف حاشیہ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ بظاہر یہ لفظ غلط ہے صحیح اس طرح ہونا چاہئے ۔ دیکھنے والے کا دل تو ایسے مقام پر یہ چاہتا ہے کہ

''اصل عبارت ہی میں غلطی کو کاٹ کر صحیح لفظ لکھ دیا گیا ہوتا''

مگر صحت نقل کے اظہار کے لئے یہ صورت اختیار کی جایا کرتی ہے، جیسے قرآن مجید میں بعض جگہ تالیف عثمان کے کاتب نے جو کتابت کی غلطیاں کردی تھیں

جیسے لا ذبحنہ میں "لا" کے بعد ایک الف جو یقینا غلط ہے، اس لئے کہ یہ لائے نافیہ نہیں، جس کے بعد اذبحنہ فعل آئے، بلکہ لام تاکید ہے جس سے اذبحنہ فعل متصل ہے۔

مگر اس قسم کے اغلاط کو بھی دور کرنا، بعد کے مسلمانوں نے صحت نقل کے خلاف سمجھا۔ اسی طرح املائے قرآن گویا ایک تعبدی شکل سے معین ہوگیا۔ بعض جگہ ''رحمۃ'' کی ''ت'' لمبی لکھی جاتی ہے، بعض جگہ جنّت بغیر الف کے لکھا جاتا ہے ۔ بعض جگہ یدعو جیسے فعل واحد میں بھی وہ الف لکھا ہوا ہے کہ جو جمع کے بعد غیر ملفوظی ہونے کے باوجود لکھا جایا کرتا ہے۔

ان سب خصوصیات کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے، جس سے مقصود وثاقتِ

نقل میں قوت پیدا کرنا ہے۔اسی طرح علامہ سید رضی نے جس شکل میں جو فقرہ دیکھا اس کو درج کرنا ضروری سمجھا تا کہ کسی قسم کا تصرف کلام میں ہونے نہ پائے۔ یہ ایک ورایتی پہلو ہے جو اس تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے کہ یہ کتاب سید رضی رحمۃ اللہ کی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہو۔

دوسرا امر:

دوسرا پہلو خطبوں کے درمیان کے **و منھا، و منہ** ہیں، جس میں عموماً بعد کا حصہ قبل سے بالکل غیر مرتبط ہوتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قبل کا حصہ قبل بعثت سے متعلق ہے یا اوائل بعثت سے اور بعد کا حصہ بعد وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہے۔ یہ بھی دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہوجایا کرتا ہے۔مگر اس سے بھی اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اگر یہ سید رضی کا کلام ہوتا تو فطری طور پر اس سے تسلسل ہوتا یا اگر انہیں دو موضوعات پر لکھنا ہوتا تو اسے وہ دو خطبوں میں مستقل طور پر تحریر کرتے، لیکن وہ کیا کرتے جبکہ انہیں کلام امیر المومنین ہی کا انتخاب پیش کرنا تھا۔اس لئے جہاں خطبہ کا پہلا جز اور آخر کا جز دو مختلف موضوعات سے متعلق ہے اور درمیان کا حصہ کسی وجہ سے وہ درج نہیں کر رہے ہیں تو نہ وہ اس کو کلام واحد بنا سکتے ہیں نہ مستقل دو خطبے بلکہ انہیں ایک ہی کلام میں **و منھا** کے فاصلے قائم کرنا پڑتے ہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ یہ شکل بعض جگہ تو انتخاب کی وجہ سے ہوئی ہے اور بعض جگہ یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ سابق میں قلمی کتابوں کے سوا کوئی دوسری شکل مواد کے فراہم ہونے کی نہ ہوتی تھی اور قلمی کتابوں کے اکثر نسخے منحصر بفرد ہوتے تھے۔اب اگر ان میں درمیان کا حصہ کرم خوردہ ہوگیا ہے یا اوراق ضائع ہوگئے ہیں یا رطوبت سے روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے وہ قبل ناقرأت ہے تو علامہ سید رضی اس موقع پر درمیان کا حصہ نقل کرنے سے قاصر رہے ہیں اور حرص جمع وحفاظت میں انہوں نے اس کے قبل یا بعد یا

وسط کے وہ سطور تلاش کئے ہیں جو کسی مستقل مفاد کے حامل ہیں اور اس طرح درمیان کے حصوں میں انہوں نے ومنہا کہہ کر اس کے درج کرنے سے عاجزی ظاہری کی ہے یہ بھی ہے کہ اس وقت علم کا ایک بڑا ذخیرہ حفاظ وادباء ومحدثین کے سینوں میں ہوتا تھا۔

فرض کیجئے کسی اپنے استاد اور شیخ حدیث سے علامہ سید رضی نے کسی موقع کی مناسبت سے خطبہ کا ابتدائی حصہ سن لیا اور انہوں نے اسے فوراً قلم بند کرلیا، پھر دوسرے موقع پر انہوں نے ان کی زبان سے اسی خطبہ کے کچھ دوسرے فقرات سنے اور انہیں محفوظ کرلیا اور اتنا موقع نہ مل سکا کہ درمیانی اجزاء ان سے دریافت کر کے لکھتے۔ اس طرح انہوں نے اس کی خانہ پری **و منہا** کے ذریعہ سے کی۔

یہ بھی اس کی دلیل قوی ہے کہ انہوں نے اصل کلام امیر المومنین کے ضبط وحفظ ہی کی کوشش کی ہے، قطعاً کوئی تصرف خود نہیں کرنا چاہا۔

تیسرا امر:

تیسرا شاہد اس کا خود جناب رضی کے وہ مختصر تبصرے ہیں جو کہیں کہیں کچھ خطبوں کے بعد انہوں نے اس کلام کے متعلق اپنے احساسات وتاثرات کے اظہار پر مشتمل درج کر دیئے ہیں یا بعض جگہ کچھ الفاظ کی تشریح ضرور سمجھی ہے۔ ان تبصروں کی عبارت نے ان خطبوں سے متصل ہوکر ہر صاحب ذوق عربی دان کے لئے یہ اندازہ قطعی طور پر آسان کر دیا کہ ان تبصروں کا انشاپرداز وہ ہرگز نہیں ہوسکتا، جو ان خطبوں کا انشاپرداز ہے جس طرح خود علامہ رضی نے اپنے مایۂ ناز تفسیر حقائق تنزیل میں اعجازِ قرآن کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ باوجود یہ کہ امیر المومنین کا کلام جو فصاحت وبلاغت میں مافوق البشر ہے مگر جب خود حضرت کے کلام میں کوئی قرآن کی آیت آجاتی ہے تو وہ اس طرح چمکتی ہے جس طرح سنگریزوں میں گوہر شاہوار بالکل اسی شکل سے

اگرچہ علامہ سید رضی اپنے دور کے افصح زمانہ تھے اور ادب عربی میں معراج کمال پر فائز تھے، مگر نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے بعد جب ان کی

عبارت آجاتی ہے تو ہر دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کی نگاہ بلندیوں سے گر کر نشیب میں پہنچ چکی ہے، حالانکہ ان عبارتوں میں علامہ سید رضی نے ادبیت صرف کی ہے اور اپنی حد بھر اپنی قابلیت دکھائی ہے، مگر سابق کلام کی بندی کو ہر مطالعہ کرنے والے کے لئے ایک امر محسوس کی حیثیت سے ظاہر کر دیا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا داخلی شاہد ہے، اس تصور کے غلط ہونے کا وہ علامہ سید رضی کا کلام ہو۔

چوتھا امر:

یہ ہے کہ جناب سید رضی اپنے دور کے کوئی گمنام شخص نہ تھے وہ دینی و دینوی دونوں قسم کے ذمہ دار منصبوں پر فائز تھے یہ دور بھی وہ تھا جو مذہب وملت کے علماء وفضلاء سے بھرا ہوا تھا۔ بغداد سلطنت عباسیہ کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے مرکز علم وادب بھی تھا۔خود سید رضی کے استاد شیخ مفید بھی نہج البلاغہ کے جمع وتالیف کے دور میں موجود تھے اس لئے کہ جناب شیخ مفید خود سید رضی کی وفات کے بعد تک کو موجود رہے ہیں اور شاگرد کا انتقال استاد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور معاصرین کو تو ایک شخص کے متعلق الزامات کی تلاش رہتی ہے۔ پھر شریف رضی سے تو خود حکومت وقت کو بھی مخاصمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے جو فاطمین مصر کے خلاف حکومت نے مرتب کیا تھا اور جس پر علامہ رضی کے عواقب ونتائج سے بے نیاز ہو کر اس پر دستخط سے انکار کر دیا تھا۔

علاوہ اس کے کہ اس کردار کا شخص جو صداقت کو ایسے قوی ترین محرکات کے خلاف محفوظ رکھے اس طرح کی چھچھوری بات کر ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک پوری کتاب خود لکھ کر امیر المومنین علیہ السلام کی جانب منسوب کر دے جس کا غلط ہونا علمائے عصر سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا اور اگر بالفرض وہ ایسا کرتے اس دور میں ان کے خلاف علمائے وقت اور ارکان حکومت کی طرف سے اس الزام کو شدت سے اچھالا جاتا اور سخت سے سخت نکتہ چینی کی جاتی ۔ حالانکہ ہمارے سامنے خود ان کے عصر کے علما کی کتابیں اور ان کے بعد کے کئی صدی تک کے مصنفین کے تحریرات موجود ہیں ان میں سے کسی میں کمزور

سے کمزور طریقہ پر بھی ان کے حالات زندگی میں اس قسم کے الزام کا عائد کیا جانا یا اس بارے میں ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کا ہونا موجود نہیں ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ یہ صرف نہج البلاغہ کے بعض مندرجات کو اپنے معتقدات کے خلاف پاکر کچھ متعصب افراد کی بعد کی کارستانی ہے جوانہوں نے نہج البلاغہ کو کلامِ سید رضی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ورنہ خود جناب سید رضی علیٰ اللہ مقامہ کے دور میں اس کے مندرجات کا کلام امیرالمومنین علیہ السلام ہونا بالاتفریق فرقہ و مذہب ایک مسلّم چیز تھی اوراسی لئے ان پر اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکا۔

پانچواں امر:

یہ ہے کہ سید رضی علی اللہ مقامہ کے قبل ایسا نہیں ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبوں کا کوئی نام ونشان عالم اسلامی میں نہ پایا جاتا ہو، بلکہ کتب تاریخ وادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلم الثبوت ذخیرہ بحیثیت خطب امیرالمومنین علیہ السلام کے سید رضی کے قبل سے موجود تھا۔ چنانچہ مورّخ مسعودی نے جو علامہ سید رض سے مقدم طبقہ میں ہیں بلکہ ان کی ولادت کے قبل وفات پاچکے تھے۔اس لئے علامہ سید رضی کا دور شباب ہی میں ۴۰۶ھ میں انتقال ہوا ہے اورمسعود کی وفات ۳۴۰ھ میں ہوچکی تھی،جس وقت سید رضی کے استاد شیخ مفید ہی نہیں بلکہ ان کے بھی استاد شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی بھی زندہ تھے۔مسعودی نے اپنی تاریخ مروج الذہب میں لکھا ہے کہ:

والذی حفظ الناس عنه من خطبه فی سائر مقاماته اربعمائه خطبة و نیف و ثمانون خطبة یوردها علی البدیهة تداول الناس ذالك عنه قولاً و عملاً۔

لوگوں نے آپ (حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام) کی جو خطبے مختلف موقعوں کے محفوظ کر لئے ہیں، وہ چارسو اسّی سے کچھ زیادہ تعداد میں ہیں۔جنہیں آپ نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا تھا،جنہیں

لوگوں نے نقل قول کے طور بھی بتواتر نقل کیا ہے اور اپنے خطب ومضامین میں ان کے اقتباسات وغیرہ سے بکثرت کام بھی لیتے رہے ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ یہ چارسواسّی (۴۸۰) سے کچھ اوپر خطبے اگر تمام وکمال یکجا کئے جائیں تو بلا شبہ نہج البلاغہ سے بڑی کتاب مرتّب ہوسکتی ہے۔جب یہ اتنا بڑا ذخیرہ سید رضی کی ولادت سے پہلے سے موجود تھا تو پھر علامہ سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس ذخیرہ سے کام نہ لیں اور اپنی طرف سے نہج البلاغہ ایسی کتاب کو تحریر کردیں۔ایسا اس شخص کے لئے کیا جاتا ہے جو گمنام ہو اور جس کا کارنامہ کوئی موجود نہ ہو اور اس کے خلاف یا منتسبین خواہ مخواہ اس کو نمایاں بنانے کے لئے اس کی جانب سے کوئی کارنامہ تصنیف کردیں۔صرف علامہ مسعودی کا یہ قول ہی اس ذخیرہ کے ثبوت کے لئے کافی تھا،جبکہ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ذخیرہ آثار قدیمہ کے طور پر کسی دور و دراز عجائب خانہ یا کسی ایک عالم کے متروکات میں شامل نہیں تھا جس تک رسائی کسی زحمت کی طلبگار ہوتی ہو، بلکہ حفظ الناس اور تداول الناس کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ عموماً اہل علم کے ہاتھوں میں موجود اور متداول تھا۔اس کے علاوہ دور عباسیہ کے یگانۂ روزگار کاتب عبدالحمید بن یحییٰ متوفی ۱۳۲ھ کا یہ مقولہ علامہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں درج کیا ہے کہ:

حفظت سبعين خطبة من خطب الاصلع ففاضت ثم فاضت

میں نے ستر خطبے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے از بر کئے ہیں،جن کے فیوض وبرکات میرے یہاں نمایاں ہیں۔

اس کے بعد ابن المقفع متوفی ۱۳۲ھ کا اعتراف ہے جسے علامہ حسن الندوبی

---

[1] مروج الذہب،ج ۲،ص ۳۳،طبع مصر

نے اپنے ان حواشی میں، جو کتاب ''البیان والتبیین للجاحظ'' پر لکھے ہیں، وہ ابن مقفع کے بارے میں لکھتے ہیں:

الظاهر انه تخرج في البلاغة على خطب الامام علي ولذلك كان يقول شربت من الخطب من ريا ولم اضبط لها رويافغاضت ثم فاضت۔

غالباً ابن المقفع نے بلاغت میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خطبوں سے استفادہ کیا تھا اور اسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ میں خطبوں کے چشمہ سے سیراب ہوکر پیا ہے اور اسے کسی ایک طریقہ سے محدود نہیں رکھا ہے تو اس چشمہ کے برکات بڑھے اور ہمیشہ بڑھتے رہے۔

اس کے بعد ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ یہ بھی سید رضی سے مقدم ہیں اور ان کا یہ قول ہے:

حفظت من الخطابة كنز الا يزيده الانفاق الا سعة و كثرة حفظت مائته فصل من مواعظ علي ابن ابي طالب۔

میں نے خطابت کا ایک خزانہ محفوظ کیا ہے، جس سے جتنا زیادہ کام لیا جائے، پھر بھی اس میں برکت زیادہ ہی ہوتی رہے گی۔ میں نے سو فصلیں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مواعظہ میں سے یاد کی ہیں۔

ابن نباتہ کے اس قول کا بھی ابن ابی حدید نے تذکرہ کیا ہے۔

رجال کشی میں ابو الصباح کنانی کے حالات میں لکھا ہے کہ زید ابن علی ابن الحسین کہ جو زید شہید کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی شہادت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانۂ امامت میں ہوئی وہ برابر امیر المومنین علیہ السلام کے خطبوں کو سنا کرتے تھے۔

ابو الصباح کہتے ہیں: کان یسمع منی خطب امیر المومنین علیہ السلام۔

یہ دوسری صدی ہجری کا ذکر ہے اور اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک ذخیرہ خطبوں کا اس وقت بھی موجود تھا۔ جو مسلّم طور پر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا تھا۔

رجال کبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ زید ابن وہب جہنی متوفی حدود ۹۰ھ نے جو خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے رواۃ احادیث میں سے ہیں۔ آپ کے خطبوں کو جمع کیا تھا اور اس کے بعد اور متعدد افراد ہیں، جنہوں نے سید رضی کے پہلے حضرت نے خطب و اقوال کو جمع کیا جیسے:

۱۔ ہشام ابن محمد ابن سائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ ان کے جمع و تالیف کا ذکر فہرست ابن ندیم ج، ۷، ص، ۲۵۱ میں موجود ہے۔

۲۔ ابراہیم ابن ظہیر فرازی، ان کا ذکر فہرست طوسی میں یوں ہے:

صنّف کتبا منها کتاب الملاحم و کتاب خطب علی علیه السلام۔

متعدد کتابیں تصنیف میں۔ منجملہ ان کے کتاب الملاحم اور کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

اور رجال نجاشی میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

۳۔ ابو محمد مسعدہ ابن صدقہ عبدی۔ ان کے متعلّق رجال نجاشی میں ہے:

له کتب منها کتاب خطب امیر المومنین علیه السلام

ان کے متعدد تصنیفات ہیں، جن میں سے ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

۴۔ ابو القاسم عبد العظیم ابن عبد اللہ حسنی، جن کا مزار تہران کے تھوڑے فاصلہ

پر شاہ عبد العظیم کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ان کے جمع کردہ خطبوں کا ذکر رجال نجاشی میں اس طرح ہے۔

له كتاب خطب امير المومنين عليه السلام

ان کی ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

۵۔ ابوالخیر صالح ابن ابی حماد رازی، یہ بھی امام علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔نجاشی میں ہے:

له كتب منها كتاب خطب امير المومنين عليه السلام

منجملہ آپ کی تالیفات کے خطب امیر المومنین علیہ السلام ہے۔

٦۔ علی ابن محمد ابن عبد اللہ مدائنی متوفی ۲۳۵ھ ۔ انہوں نے حضرت کے خطبوں کو اور ان مکاتیب کو جمع کیا، جو حضرت نے اپنے عمال کو تحریر فرمائے تھے، اس کا ذکر معجم الادبار یاقوت حموی ج ۵،ص ۳۱۳ میں ہے۔

۷۔ ابو محمد عبد العزیز جلودی بصری توفی ۳۳۰ھ کے تصانیف میں کتاب خطب علی علیہ السلام، کتاب رسائل، کتاب مواعظِ علی علیہ السلام کتاب خطب علی علیہ السلام فی الملاحم، کتاب دعائے علی علیہ السلام موجود ہیں، جن کا تذکرہ شیخ طوسی نے فہرست میں اور نجاشی نے ان کے طویل تصنیفات کے ذیل میں اپنے رجال میں کیا ہے۔

۸۔ ابو محمد حسن ابن علی ابن شعبہ حلبی متوفی ۳۲۰ھ نے اپنے مشہور کتاب تحف العقول (ص ۱۳، طبع ایران) میں امیر المومنین کے کچھ کلمات امثال اور خطب کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

انا لو استغرقنا جميع ما وصل الينا من خطبه وكلامه فى التوحيد خاصة دون ماسواه من المعانى

لکان مثل جمیع ھذا الکتاب۔

اگر ہم وہ سب لکھنا چاہیں، جو ہم تک حضرت علیہ السلام کے خطبے اور آپ کا کلام صرف توحید کے بارے میں پہنچا ہے علاوہ دوسرے موضوعات کے تو وہ پوری اس کتاب (تحف العقول) کے برابر ہوگا۔

اب مذکورہ بالا تفصیل پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی میں زید بن وہب جہنی نے حضرت کے خطبوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔

دوسری صدی میں عبدالحمید ابن یحییٰ کاتب اور ابن مقفع کے دور میں وہ ذخیرہ مسلّم طور پر موجود تھا اور اس صدی کے وسطی دور میں وہ خطبے پڑھے اور سنے جاتے تھے، جیسا کہ زید شہید کے واقعہ سے ظاہر ہوا اور ادباء اس کو زبانی حفظ کرتے تھے، جیسا کہ عبد الحمید اور ابن مقفّع کے تصریحات سے ظاہر ہوا۔

تیسری صدی میں متعدد مصنفین نے جو جو خطبے ان تک پہنچے تھے، ان کو مدوّن کیا۔ ایسی صورت میں جناب سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ ان تمام ذخیروں کو نظر انداز کر کے یہ دماغی کاوش و کاہش گوارا کریں کہ وہ از خود کلام امیر المومنین علیہ السلام کے نام سے کوئی چیز تصنیف کریں۔

چھٹا امر:

یہ ہے کہ ان تمام ذخیروں کے سابق سے موجود ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ علامہ سید رضی کے لئے یہ تو قطعی ممکن نہیں تھا کہ وہ ان تمام ذخائر کو تلف کرا دیتے اور پھر اسی کی ترویج کرتے جو انہوں نے کلامِ امیر المومنین علیہ السلام قرار دیا تھا یہ قطعی ناممکن تھا اگر وہ ذخیرہ کسی ایک مصنّف کے پاس کسی ایک دور دراز جگہ ہوا، تو امکان بھی تھا، جیسا کہ مشہور ہے کہ شیخ ابو علی سینا نے فارابی کے تمام مصنفات کو کسی شخص سے حاصل کر کے انہیں تلف کر دیا اور ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔

یہاں یہ صورت قطعاً ناممکن تھی جبکہ وہ کلام ادباء کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اطراف و اقطار عالم اسلامی میں منتشر تھا اور بہت سے مصنّفین اس کی تدوین کر چکے تھے۔ پھر جبکہ سید رضی کی تصنیف کے ساتھ ان ذخائر کا موجود ہونا لازمی تھا تو اگر سید رضی کا جمع کردہ کلام اس ذخیرہ سے مختلف ہوتا یا اسلوب بیان میں اس سے جدا ہوتا تو وہ تمام ادبائے زمانہ، خطبائے رزوگار، علمائے وقت جو اس کالم کو دیکھتے ہوئے، پڑھے ہوئے یا یاد کئے ہوئے تھے، صدائے احتجاج بلند کر دیتے، ان میں تلاطم ہوجاتا اور سید رضیؒ تمام دنیا میں اس کی وجہ سے بدنام ہوجاتے۔ کم از کم کوئی ان کے ہم عصر ادباء میں سے اس کی تنقید ہی کرتا ہوا ایک کتاب ہی اس موضوع پر لکھ دیتا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا جو کلام اب تک محفوظ رہا یہ سید رضی کے جمع کئے ہوئے ذخیرہ سے مختلف ہے خصوصاً جب وہ وجہ جو بعد میں ایک طبقہ کو اس باب میں انکار یا تشکیک کی موجب ہوئی، جس کی تفصیل کسی حد تک آئندہ درج ہوگی۔ وہ ایک مذہبی بنیاد تھی یعنی یہ کہ نہج البلاغہ میں ان افراد کے بارے میں جنہیں سواد اعظم قابل احترام سمجھتا ہے کچھ تعریفات یا انتقادی کلمات ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سلطنت عباسیہ کے دار السلطنت میں لکھی گئی جو اہل سنت کا علمی مرکز تھا اس قوت بڑے بڑے علما، حفاظ، ادبا، خطبا، اہل سیر اور محدثین اہل سنت میں موجود تھے اور ان کا جم غفیر خاص بغداد میں موجود تھا اگر امیر المومنین علیہ السلام کے وہ خطبات جو ابن المقفع، ابن نباتہ، عبدالحمید ابن یحییٰ، جاحظ اور دیگر مسلّم الثبوت ادباء کے دور میں موجود تھے، ان تعریضات سے خالی تھے اور اس قسم کے مضامین ان میں نہ تھے، بلکہ فطری طور پر اس صورت میں اس کے خلاف چیزوں پر انہیں مشتمل ہونا چاہئے تھا، تو اس وقت کے اہل سنت کے علماء اس پر قیامت برپا کردیتے اور اس کے اپنے مذہب کے خلاف ایک عظیم حملہ تصور کر کے پورے طور سے اس کا مقابلہ کرتے اور اس کی دھجیاں اڑا دیتے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، کوئی دھیمی سی آواز بھی اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ یہ اس کا قطعی ثبوت ہے کہ سید رضی کے جمع کردہ مجموعہ میں کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ وہ وہی تھا

جواس کے پہلے مضبوط و مدون، متداول ومحفوظ رہ تھا، علماء قطعا اس سے اجنبیت نہ رکھتے تھے بلکہ اس سے مانوس اور اس کے سننے کے اور یاد کرنے کے عادی تھے وہ اس ادبی ذخیرہ کو اس کی ادبی افادیت کے اعتبار سے سرآنکھوں پر رکھتے تھے اور اس تنگ نظری میں مبتلا نہ تھے کہ چونکہ اس میں کچھ چیزیں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں، اس لئے اس کا انکار کیا جائے یا اس سے اجنبیت برتی جائے۔

ساتوں امر:

یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علامہ سید رضی کے قبل کی اس وقت بھی ایسی موجود تھی، جن میں امیرالمومنین علیہ السلام کے اکثر مواقع کے کلامی خطبات کو کسی مناسبت سے ذکر کیا ہے جیسے

جاحظ متوفی ۲۵۵ ھ کی البیان والتبیین،
ابن قتیبہ دینوری متوفی ۲۷۶ ھ کی عیون الاخبار وغریب الحدیث،
ابن واضح یعقوبی متوفی ۲۷۸ ھ کی مشہور تاریخ،
ابوحنیفہ دینوری متوفی ۲۸۰ ھ کی لاخبار الطوال،
ابوالعباس المبرد متوفی ۲۸۶ ھ کی کتاب المبرد
مشہور مورخ ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ ھ کی مشہور تاریخ کبیر،
ابن ورید متوفی ۳۲۱ ھ ء کی کتاب المجتنی
ابن عبدربہ متوفی ۳۲۸ ھ کی عقد الفرید،
ثقۃ الاسلام کلینی متوفی ۳۲۹ ھ کی مشہور کتاب کافی
مسعودی متوفی ۳۴۶ ھ کی تاریخ مروج الذہب،
ابوالفرج اصفہانی متوفی ۳۵۶ ھ کی کتاب اغانی،
ابوعلی قالی متوفی ۳۵۶ ھ کی کتاب النوادر،
شیخ صدوق متوفی ۳۸۱ ھ کی کتاب التوحید اور ان کے دوسرے جوامع

حدیث،

شیخ مفید رحمہ اللہ، متوفی ۴۱۳ھ، اگر چہ تاریخ وفات کے اعتبار سے جناب رضی موخر ہیں مگر ان کے استاد ہونے کی وجہ سے طبقۃً مقدم ہیں، ان کی کتاب الارشاد اور کتاب الجمل، ان تمام کتابوں میں جو حضرت کے خطبے درج ہیں، ان کا جب مقابلہ علامہ سید رضی کے مندرجہ خطب اور اجزاء کلام سے کیا جاتا ہے تو اکثر تو وہ بالکل متحد ہوتے ہیں اور نہج البلاغہ میں ایسا درج شدہ کلام اگر کوئی ہے جو ان کتابوں میں درج نہیں ہے یا ان کتابوں میں کوئی کلام ایسا ہے جو نہج البلاغہ میں مذکور نہیں ہے۔ تو اسلوب بیان اور انداز کلام، تسلسل و بلند آہنگی، جوش وحقائق نگاری کے لحاظ سے یقیناً متحد ہوتا ہے جس میں کسی واقف عربیت کو شک نہیں ہوسکتا۔ امیر المومنین کے اس کلام کا جو نہج البلاغہ میں درج ہے اس تمام کلام سے جو حضرت کی طرف نسبت دے کر اور دوسری کتابوں میں درج ہے متحد الاسلوب ہونا پھر اس پہلو کے ضمیمہ کے ساتھ جس کا پہلے تذکرہ ہوچکا ہے کہ وہ خود سید رضی کے اس کلام سے جو نہج البلاغہ میں بطور مقدمہ یا یہ تبصرہ موجود ہے۔ بالکل مختلف ہونا ایک غیر جانب دار شخص کے لئے اس کا کافی ثبوت ہے کہ یہ واقعی امیر المومنین ہی کا کلام ہے جسے علامہ سید رضی نے صرف جمع کیا ہے۔

آٹھواں امر:

یہ ہے کہ کہ خود علامہ سید رضی کے معاصرین یا ان سے قریب العہد متعدد لوگوں نے بطور خود بھی کلام امیر المومنین علیہ السلام جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کیا ہے جیسے:

ابن مسکویہ متوفی ۴۲۱ھء نے تجازب الامم میں،

حافظ ابونعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ نے حلیۃ الاولیا میں،

شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی متوفی ۴۶۰ھ نے جو شیخ مفید رحمہ اللہ نے تلمذ کی حیثیت سے علامہ رضی کے ہم طبقہ اور علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے شاگرد ہونے کی حیثیت

سے اور نیز سال وفات کے اعتبار سے ان سے ذرا موخر ہیں ۔ اپنی کتاب، تہذیب اور کتاب الامالی میں،

نیز عبد الواحد ابن محمد ابن عبد الواحد آمدی جو اسی عصر کے تھے اپنی مستقل کتاب غرر الحکم و درر الکلم جو امیر المومنین علیہ السلام کے مختصر کلمات پر مشتمل ہے اور مصر اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے ۔

نیز ابو سعید منصور ابن حسین آبی وزیر متوفی ۴۲۲ھ اپنی کتاب نزہۃ الادب ونثر الدرر میں جس کا ذکر کشف الظنون باب النون میں اور قاضی ابوعبد الہ محمد بن سلامہ قطاعی شافعی متوفی ۴۵۳ھ جن کی عظیم الشان کتاب اس موضوع پر دستور معالم الحکم کے نام سے ہے اور وہ مصر میں طبع ہو چکی ہے یہ سب تقریبا سید رضی کے معاصرین ہی ہیں ۔ ان سب کی کاوشیں ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ سوائے ابو سعید منصور کی کتاب کے جس کا کشف الظنون میں تذکرہ ہے باقی یہ سب کتابیں مطبوع و متداول ہیں ۔ ان میں جو کلام مندرج ہے وہ بھی علامہ سید رضی کے درج کردہ کلام سے عیناً متحد یا اسلوب میں متفق ہی ہے ۔

پھر اگر سید رضی کی نسبت یہ تصور کیا جائے کہ انہوں نے خود اس کلام کو تصنیف کر دیا ہے تو ان تمام جامعین اور اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کرنے والے دوسرے افراد کو کیا کہا جائے گا ۔ پھر ان کی نسبت بھی یہی تصور کرنا چاہیئے ، جبکہ ان میں سے سب یا زیادہ افراد یقیناً جلالت شان اور ورع وتقویٰ وغیرہ میں علامہ سید رضی سے بالاتر نہیں معلوم ہوتے ۔

اب اگر ان سب کی نسبت یہی خیال کیا جائے ، تو خیر علامہ سید رضی تو اشعر الطالبین تھے اور کتب سیر انہیں خود ادبیت اور فصاحت و بلاغت میں معراج کمال پر ظاہر کرتے ہیں ۔ مگر ان میں سے ہر شخص کی نسبت تو یہ تصور قطعی غلط ہے کہ وہ سب علامہ سید رضی ہی کے ادبی حیثیت سے ہم پایہ تھے پھر ایسے مختلف المرتبہ اشخاص کی ذہنی کاوشوں اور قلمی ثمرات میں اتنا ہی فرق کیوں نہیں ہے ، جو خود ان اشخاص کے مبلغ علمی میں یقینی

طور پر پایا جاتا ہے۔ اشخاص کہ جو کلام کے جمع کرنے والے ہیں ان میں آپس میں زمین و آسمان کا فرق اور کلام جو انہوں نے جمع کیا ہے وہ سب ایک ہی مرتبہ، ایک ہی شان کا اسے دیکھتے ہوئے سوائے ایسے شخص کے جو جان بوجھ کر حقیقت کے انکار کرنے پر تلا ہوا ہو اور کسی کو اس میں شک وشبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا کہ ان اشخاص کا کارنامہ صرف جمع و تالیف ہی ہے۔ جس میں ان کے سلیقہ اور ذوق کا ااختلاف فقط شان ترتیب اور عنوان تالیف میں نمودار ہوتا ہے، لیکن اصل کلام میں ان کی ذاتی قابلیت، ذہانت اور مبلغ علمی اور معیار ادبی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔

نواں امر:

یہ ہے کہ مذکورہ بالا افراد اگر چہ اپنے زمانۂ حیات کے کچھ حصوں میں علامہ سید رضی سے متحد ہیں، مگر ان میں سے متعدد افراد کے سال وفات کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہے کہ ان کا زمانہ جمع وتالیف نہج البلاغہ سے موخر ہے اور اس کے بعد ایک ایسا طبقہ ہے جو بالکل علامہ رضی سے موخّر ہی ہے۔ جیسے ابن ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ، سبط ابن جوزی متوفی ۶۰۶ھ اور اس کے بعد بہت سے مصنفین۔ ظاہر ہے کہ علامہ رضی کی کتاب نہج البلاغہ گوشہ گمنامی میں اور ان لوگوں سے مخفی نہ تھی۔ ان لوگوں کا محرّک اس جمع وتالیف پر صرف یہ تھا کہ علامہ سید رضی نے انتخاب سے کام لیتے ہوئے یا ماخذوں کی کمی سے یا ان نسخوں کے کرم خوردہ یا ناقص ہونے کی وجہ سے جو ان کے پاس تھے، بہت سے اجزائے کلام امیر المومنین علیہ السلام کے نقل نہیں بھی کئے تھے۔ اس لئے مصنفین کو مستدرک اور مستدرک در مستدرک کی ضرورت پڑتی رہی، جس کا سلسلہ ماضی قریب میں علامہ شیخ ہادی آل کاشف الغطا تک جاری رہا۔ جنہوں نے مستدرک نہج البلاغہ تحریر فرمایا جو نجف اشرف میں طبع ہو چکا ہے۔

اگر علامہ سید رضی کے قریب العہد یا ان کے بعد کے اہل قلم کو بھی نہج البلاغہ کے مندرجہ کلمات وخطب میں یہ خیال ہوتا کہ یہ جناب سید رضی نے تصنیف کر کے اس میں

شامل کردیئے ہیں تو وہ سب بالخصوص معاصرین جو کسی رعایت کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے، اپنی کتابوں کی وجہ تالیف میں اس کا تذکرہ ضرور سمجھتے چونکہ اس کے قبل جو کتاب امیرالمومنین علیہ السلام کے خطبوں پر مشتمل کہہ کر لکھی گئی ہے اس میں آپ کا اصل کلام موجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ساختہ و پرداختہ اور وضعی ہے، اس لئے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم آپ کا اصلی کلام منظر عام پر لائیں، جبکہ ایسا نہیں ہوا اور یہ بالکل مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ان سب کے نزدیک علامہ سید رضی نے جو کلام جمع کیا، وہ بلاشبہ کلام امیرالمومنین علیہ السلام کی حیثیت سے اس کے پہلے سے مدوّن ومتداول تھا۔ ان کی سید رضی سے شکایت صرف بعض خطبوں کو چھوڑ دینے یا احاطہ واستقاضہ نہ کرنے یا شان ترتیب وعنوان تالیف میں کسی مناسب تر صورت کو اختیار نہ کرنے ہی کی تھی جس کے لئے انہوں نے بھی اس بارے میں کوشش ضروری سمجھی، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ممکن ہے کہ بعض مصنفین اب بھی کسی خاص ترتیب سے نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب کو دے رکھنے کے متمنی ہوں۔ یہ دوسری چیز ہے اور اصل کلام کے بارے میں کسی شک وشبہ کا رکھنا دوسری چیز ہے۔

دسواں امر:

تلاش کی جاتی ہے کہ نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب واقوال کا پتہ اب بھی بعینہ الفاظ نہج البلاغہ کے قبل تالیف شدہ کتابوں میں مل جاتا ہے اور جبکہ اکثر حصہ اس کا قبل کی کتابوں میں مندرج موجود ہے تو تھوڑا سا حصہ اگر دستیاب نہ بھی ہو تو ایک معتدل ذہن میں اس سے کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوسکتا، جبکہ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں مختلف حوادث کے ذیل میں کتابوں کے اتنے ذخیرے تلّف ہوئے ہیں جو اگر موجود ہوتے تو یقیناً موجودہ ذخائر سے بدرجہا زیادہ ہوتے خود تاریخ نے کلام امیرالمومنین علیہ السلام کے جن جمع شدہ ذخیروں کا پتہ علامہ سید رضی کے قبل ہم تک پہنچتا ہے وہی سب اس وقت کہاں موجود ہیں؟ اس لئے اگر بعض مندرجات رائج الوقت کتابوں میں نہیں بھی ملتے تو ذہن

یہی فیصلہ کرتا ہے کہ ان کتابوں میں موجود ہوں گے، جن تک ہماری اس وقت دسترس نہیں ہے۔ نہج البلاغہ کے مندرج کے ان حوالوں کو پہلے علامہ شیخ ہادی کاشف الغطا نے مستدرک نہج البلاغہ کے اثنائے تالیف ہی میں مدارک نہج البلاغہ کے نام سے مرتّب کیا تھا، جو غالباً مکمل شائع نہیں ہوا اور ایک قابل قدر کوشش رامپور کے ایک سنی فاضل عرشی صاحب نے کی ہے، جو فاران کراچی میں مقالہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے اورمزید تلاش کی جائے تو اس سلسلہ میں مزید کامیابی کا بھی امکان ہے۔

گیارہواں امر:

محققین علمائے شیعہ کا رویہ دیکھا جائے تو وہ ہر اس کتاب مجموعہ کو جو معصومین علیہم السلام میں سے کسی کی طرف منسوب ہو بلا چون و چرا صرف اس لئے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوجاتے کہ وہ معصومین علیہم السلام کی جانب منسوب ہے بلکہ وہ پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ محققانہ فریضہ کو انجام دیتے ہوئے اگر وہ قابل انکار ہوتا تو کھل کر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اگر مشکوک ہوتا ہے تو شک وشبہ کا اظہار کر دیا کرتے ہیں اور اس طرح بہت سے وہ ذخیرے جو معصومین علیہم السلام کے نام سے موجود ہیں۔ مقام اعتبار میں مختلف درجے اختیار کر چکے ہیں مثلا دیوان امیر المومنین علیہ السلام بھی تو بطور کلام علی علیہ السلام ہی رائج ہے مگر علمائے شیعہ بلا رو رعایت اسے غلط سمجھتے ہیں اس سے بالاتر درجہ تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام کا ہے۔ حالانکہ وہ شہرت میں تقریباً نہج البلاغہ سے کم نہیں ہے اور شیخ صدوق ایسے بلند مرتبہ قدیم محدث نے اس پر اعتماد کیا ہے مگر اکثر علمائے شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے، یہاں تک کہ ہمارے قریبی دور کے محقق علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نے ایک پورا رسالہ اس کے غلط ہونے کے اثبات میں لکھ دیا ہے، فقہ الرضا، امام رضا علیہ السلام کی طرف منسوب ہے مگر اس کے اعتبار اور عدم اعتبار کی بحث ایک مہتم بالشان علمی مسئلہ بن گئی ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح جعفریات اور

امام رضا علیہ السلام کا رسالہ ذہبیہ وغیرہ کوئی نقد و بحث سے نہیں بچا ہے اس رویہ کے باوجود سید رضی کے بعد سے اس وقت تک کسی دور میں بھی کسی شیعہ عالم کا نہج البلاغہ کے خلاف آواز بلند نہ کرنا اور اس میں ذرہ بھر بھی شک وشبہ کا اظہار نہ کرنا اس کا ثبوت قطعی ہے کہ ان سب کی نظر میں اس کی حیثیت ان تمام مجموعوں سے ممتاز اور جداگانہ ہے۔

نہج البلاغہ کے ہم پلہ اس حیثیت سے اگر کوئی کتاب ہے تو صرف صحیفہ کاملہ جو اسی طرح مسلم طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کے کلام کا مجموعہ ہے اور کوئی کتاب اس ذیل میں ان دونوں کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ علامہ سید رضی کے بعد تقریباً دو اڑھائی سو برس تک نہج البلاغہ کے خلاف کوئی آواز اٹھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتی بلکہ متعدد علمائے اہل سنت نے اس کی شرحیں لکھیں جیسے

ابوالحسن ابن ابی القاسم بیہقی متوفی ۵٦۵ ھ۔

ابن ابی الحدید ٦۵۵ ھ

علامہ سعد الدین تفتازانی وغیرہ۔

غالباً انہی علمائے اہل سنت کے شروح وغیرہ لکھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام میں نہج البلاغہ کا چرچا پھیلا اور اس کے ان مضامین کے بارے میں جو خلفائے ثلاثہ کے بارے میں ہیں اہل سنت میں بے چینی پیدا ہوئی اور اب آپس میں بحثیں شروع ہو گئیں اور اس کی وجہ سے علما کو اپنے اصول عقائد سنبھالنے کے لئے اور عوام کو تسلی دینے کے لئے نہج البلاغہ کے بارے میں شکوک وشبہات اور رفتہ رفتہ انکار ضرورت پڑی۔

چنانچہ سب سے پہلے ابن خلکان متوفی ٦٨١ ھ نے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اور علامہ سید رضی کے حالات میں یہ لکھا کہ:

قد اختلف الناس فی کتاب نهج البلاغه المجموعة
من کلام علی ابن ابی طالب هل هو جمع و اخوه الرضی

و قد قیل انه لیس من کلام علی ابن ابی طالب و انما الذی جمعه و نسبه الیه هو الذین وضعه والله اعلم۔

لوگوں میں کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں جو امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا مجموعہ ہے اختلاف ہے کہ وہ انہی (سید مرتضیٰ) کا جمع کردہ ہے یا ان کے بھائی سید رضی کا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جناب امیر المومنین علیہ السلام کا کلام ہی نہیں ہے، بلکہ جسے جامع سمجھا جاتا ہے، اسی کی یہ تصنیف ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ امر بہت قابل لحاظ ہے کہ نہج البلاغہ کے بارے میں اختلافی آواز اڑھائی صدی کے بعد بھی نہج البلاغہ کے تالیف کے مرکز یعنی بغداد یا ملک عراق کے کسی شہر سے بلند نہیں ہوئی، بلکہ مغربی مملکت جہاں بنی امیہ کی سلطنت تھی اور قیروان وقرطبہ میں جس سلطنت کے زیر اثر علماء کی پرورش ہو رہی تھی وہاں ابن خلکان مغربی کی زبان سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے ظاہر ہے کہ یہ لوگ جنہیں اختلف الناس کہا جا رہا ہے یہ مسلمان دارالخلافہ کے کوئی ذمہ دار افراد نہیں ہیں ورنہ **اختلف العلماء، اختلف المحققون، اختلف الادباء** ایسے کوئی وقیع الفاظ درج کئے جاتے بلکہ یہ الناس اموی سلطنت کے پروردہ مملکت مغربیہ کے عوام ہیں جنہیں یہ خبر تک نہیں ہے کہ یہ کتاب سید رضی کی جمع کردہ ہے یا سید مرتضیٰ کی اور یہ جناب ابن خلکان کا تقیہ ہے کہ وہ خود اپنے اطلاعات کو جو اس کتاب اور اس کے جامع کے بارے میں یقیناً ان کو تھے، پیش نہیں کرتے بلکہ عوام کے جذبات کی تسلی کے لئے خود اپنی اطلاعات کو جو اس کتاب اور اس کو جامع کے بارے میں یقیناً ان کو تھے، پیش نہیں کرتے بلکہ عوام کے جذبات کی تسلی کے لئے خود انہیں عوام کے اختلافات کی ترجمانی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ''بعض لوگ اسے سید مرتضیٰ کا جمع کردہ کہتے ہیں اور بعض سید رضی کا'' اور خود ان کے ضمیر کا فیصلہ پہلے آجاتا ہے کہ جمع کرنے والا کوئی بھی ہو، لیکن ہے وہ کلام امیر المومنین علیہ السلام ہی کا اور

پھر عوامی جذبات کو دھچکا پہنچنے کے اندیشے سے وہ بعض ان متعصب مجہول الاسم والرسم اشخاص کے اس عذر کو جو اس کے مضامین کے تسلیم کرنے سے گریز کے لئے وہ مقام مناظرہ میں پیش کرتے تھے کہ ہم اسے کلام علی علیہ السلام ہی تسلیم نہیں کرتے وہ قیل کہہ کے ذکر کر دیتے ہیں کہ بعض ایسا کہتے ہیں کہ یہ امیر المومنین علیہ السلام کا کلام ہے ہی نہیں بلکہ جس نے جمع کیا ہے اسی نے اس کو تصنیف کر دیا ہے۔ یہ خود قیل اس قول کے ضعف کے لئے کافی تھا لیکن خود ان کا ضمیر اس قیل سے چونکہ مطمئن نہیں ہے لہٰذا آخر میں واللہ اعلم کہہ کے وہ اس میں مزید شک وشبہ کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں۔

اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن خلکان اس بارے میں اپنے فیصلہ کو ماحول کے دباؤ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ صرف عوام کی باہمی چہ میگوئیوں کا تذکرہ کر کے اپنا دامن بچالے جانا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ اس قسم کی تشکیک کا علمی دنیا میں کوئی وزن ہی نہیں مانا جاسکتا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے اگر چہ علامہ ابن خلکان نے اپنے ضمیر کی تحریک سے بہت حد تک اپنے کو نہج البلاغہ کے انکار کی ذمہ داری سے بچایا تھا مگر ان کے ان الفاظ نے بعد والے میدان مناظرہ کے پہلوانوں کو آسانی سے یہ داؤ بتا دیا کہ وہ نہج البلاغہ کے کلام امیر المومنین ہونے کا انکار کر دیں چنانچہ اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی نے جو اپنے دور کے انتہائی متعصب شخص تھے، یہ جرأت کی کہ وہ اس شک کو یقین کا درجہ دے دیں اور انہوں نے سید مرتضیٰ کے حالات میں لکھ دیا کہ:

من طالع کتابه نهج البلاغه جزم بأنه مکذوب علی امیرالمومنین نفیه السب الصریح بل حط علی السیدین ابی بکر و عمر۔

جو شخص ان کی کتاب نہج البلاغہ کو دیکھے وہ یقین کر سکتا ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت بالکل

جھوٹ ہے۔ اس لئے کہ اس میں کھلا ہوا سب وشتم اور ہمارے
دونوں سرداروں ابوبکر وعمر کی تنقیص ہے۔

اب آپ ذرا اس عجیب رفتار کو دیکھئے کہ تالیف نہج البلاغہ سے دو اڑھائی سو برس بعد یعنی ابن خلکان کے عہد تک تو اختلاف یا شک وشبہ کا بھی نہج البلاغہ کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بعد ابن خلکان ملک مغرب میں بیٹھ کر عوام الناس کے اختلاف کا اس بارے میں اظہار کرتے ہیں کہ یہ سید رضی کی جمع کردہ کتاب ہے یا سید رضی کی اور ایک ضعیف قول اس کا بیان کرتے ہیں کہ اس کی نسبت امیرالمومنین علیہ السلام کی جانب غلط ہے اور پھر واللہ اعلم کہہ کر اس تغلیط کو مشکوک کرتے ہیں۔ یہ اس وقت جبکہ قرب عہد کی وجہ سے پھر بھی ذرائع اطلاع زیادہ ہو سکتے تھے اور اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی پہلے تو بیک گردش قلم اس اختلاف کو جو جامع کے بارے میں تھا، ختم کر کے اسے سید مرتضیٰ کا کارنامہ قرار دے دیتے ہیں اور پھر اس کے شک کو یقین کا درجہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ جو بھی نہج البلاغہ کا مطالعہ کرے وہ ایسا ہی یقین کرے گا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے وقت تک تین سو برس میں گویا کسی نے اس کتاب کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا یا انہیں کوئی ایسی عینک ملی ہے جو اس سے پہلے کسی کے پاس نہ تھی اور اب وہ اسی عینک سے اپنے دور کے بعد ہر شخص کو نہج البلاغہ کے مطالعہ کی دعوت دے رہے ہیں وہ عینک کیا ہے اسے خود اپنے آخر کلام میں درج کر دیتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اصول روایت کے لحاظ سے تنقیدی قوانین کے پیش نظر انہیں چاہئے تھا کہ اس کی نسبت غلط ہونے کے ثبوت میں امیرالمومنین علیہ السلام کا وہ مسلّم کلام پیش کرتے جو سید رضی کے علاوہ دوسرے مستند ماخذوں سے ان کے نزدیک مسلم ہوتا اور وہ سید رضی کے مندرجہ مضامین سے مختلف ہوتا خود سید رضی کے زمانہ والے مصنفین کے انتقادات کا حوالہ دیتے کہ انہیں نے بھی اسے غلط قرار دیا ہے۔ اس تین سو برس کی مدت میں دوسرے علما و ناقدین نے جو کچھ اس کی رد وقدح کی ہوتی اسے پیش کرتے مگر ان کے جیب و دامن تحقیق میں کوئی ایسی سند موجود نہیں

ہے۔ان کی دلیل اس نسبت کے یقینی طور پر جھوٹ ہونے کی صرف یہ ہے کہ اس میں ان کے دوسرداروں کی تنقیص ہے۔کیا علمی دنیا میں اس دلیل کی کوئی قیمت ہوسکتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے قرآن نازل ہونے کے چندصدی بعد کوئی طبقہ مشرکین کا قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا صرف اس لئے انکار کرے کہ اس میں ان کے اللہ کے خلاف تنقیص ومذمت کی آیتیں ہیں حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کو اپنے جذبات کا تابع بنا کر اگر جانچا جائے ،تو کوئی حقیقت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

اور خدائے (برحق) ان کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین

اور جو ان میں ہیں سب درہم برہم ہوجائیں۔[1]

اس دروازہ کے کھل جانے کے بعد تمام اصول رویات ودرایت معطل وبیکار ہوجاتے ہیں۔اس لئے کہ ہر عقیدہ اور خیال کا انسان پھر ہر قوی سے قوی نص کو صرف اس بنا پر رد کردے گا کہ وہ اس کے عقیدہ اور حیال کے خلاف ہے، جہاں تک خلفائے ثلاثہ کے مقابل میں شیعوں کے استدلال کا تعلق ہے وہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں تک کہ صحاح ستہ میں درجہ شدہ اخبار واحادیث سے بھی اس میں تمسک کرتے ہیں اور نہج البلاغہ کے مندرجات سے کچھ وہ احادیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فائدہ نہیں اٹھاتے محتاط اور علمی اصول کے کسی حد تک پابند علمائے اہل سنت کا یہ طریقہ رہا کہ وہ ان احادیث کے مضامین ومطالب کے تاویلوں سے ہمیشہ کام لیتے رہے اور بالکل ان احادیث کے انکار کی جرأت نہیں کی۔

مناظرانہ ضرورتوں سے انکار نصوص کا یہ رجحان جس کا مظاہرہ ذہبی نے کیا ہے یہ بڑھتے بڑھتے مرزا غلام احمد قادیانی (لعنت اللہ علی کل حال) کے زمانہ میں یہاں تک آیا کہ شروع شروع عیسائی مبلّغین سے مناظرہ میں انہیں وفات مسیح کے خیال کو پیش

---

[1] سورۂ المومنون:۷۱

کرنے کی ضرورت ہوئی۔صرف اس جذبہ کے ماتحت کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی یہ ایک طرح کی فضیلت عیسائی پیش کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں، لہٰذا اس کو ختم کرنا چاہئیں۔ انہوں نے اس مناظرانہ ترکیب کو اصل قرار دیا اور پھر جو اسلامی نصوص اور متفق علیہ احادیث اس بارے میں تھیں ان کا انکار کردیا اور آخر میں خود ان کے دعوائے مسیحیت کے لئے ایک راستہ بن گیا۔

یہی جذبہ ترقی کرکے اب اہل قرآن کے ہاتھوں ،جن کی نمائندگی کی طلوع اسلام وغیرہ کررہے ہیں، یہاں تک پہنچاہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ طبری اور دوسرے مفسرین اور مورخین سب کے یہاں کچھ نہ کچھ شیعوں کے موافق باتیں موجود ہیں، اس لئے کلیۃً احادیث تفاسیر اورتواریخ کے اعتبار پر انہوں نے ضرب لگادی ہے اوران سب کے انکارکی یہی بنیاد ہے کہ ان لوگوں نے شیعوں کے موافق چیزیں درج کی ہیں لہٰذا یہ سب جھوٹ ہے جوعمارت ایک غلط اساس پر قائم کی جاتی ہے، اس کا آخری انجام یہی ہوتا ہے۔

کاش یہ لوگ حقیقت کوصرف حقیقت کے اعتبار سے دیکھتے اور پھر اپنے جذبات کواس کے ماتحت لانے کوکوشش کرتے جوایک عام مسلمان کا فریضہ ایمانی ہے چہ جائیکہ وہ افراد جواپنے کوعلمائے اسلام قرار دیتے ہوں یا دنیامیں اس حیثیت سے متعارف ہوں۔

اس کے بعد کی صدیوں میں یہ دروازہ پاٹوں پاٹ کھل ہی گیا تھا، چنانچہ اب مناظرہ کے میدان کا یہ بہت ہی عام ہتھیار بن گیا کہ جب نہج البلاغہ کا کوئی کلام پیش ہوتو اسے غلط کہہ دیا جائے۔اس کے بعد پھر موجودہ دور میں تو اوربھی بہت سے جذبات کارفرما ہوگئے ہیں مثلاً تجدد پسند طبقے کا یہ رجحان کہ عورت ہر بات میں مرد کے برابر ہے، جب نہج البلاغہ کے مندرجات سے مجروح ہوتا ہےتو اس جذبہ کےتحفظ کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کا کلام نہیں ہے اس لئے کہ اس میں عورتوں کی تنقیص ہے اور موجودہ سائنس سے اس کے نظریات کوٹکراتے ہوئے دیکھا جاتا ہےتو

سائنس کو اصل قرار دے کر اس کا انکار کر دیا جاتا ہے کہ یہ حضرت علی علیہ السلام کا کلام ہو، کبھی اس جذبہ کے ماتحت کہ اس میں ان علوم وفنون کی حقیقتوں کا اظہار ہے جسے بعد والے اپنے وقت کا کارنامہ سمجھتے ہیں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام بعد کی پیداوار ہے۔ اس لئے کہ اس وقت عرب میں یہ علوم وفنون تھے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ کسی ایک لفظ مثلاً سلطان بمعنی بادشاہ کو حادث قرار دے کر اس لفظ کے استعمال کو نہج البلاغہ میں اس کی دلیل بنایا جاتا ہے کہ یہ جناب امیر کی زبان سے نہیں نکل سکتا حالانکہ یہ سب باتیں صرف اپنی خواہشوں کی تکمیل کا ایک بہانہ ہیں اور اپنے مزعومات کو اصل قرار دے کر حقیقتوں کو ان کا تابع بنا لینے کا کرشمہ ہے۔

قرآن مجید میں درج شدہ حقائق کب ایسے ہیں جو اس وقت کے عربوں کو معلوم ہوں اور احادیث رسول ص کے بہت سے معارف کب اس وقت کی دنیا کو معلوم تھے جو باب مدینۃ العلم کے اقوال میں کچھ ایسے علوم وفنون کے انکشاف پر تعجب کیا جاتا ہے ظاہر کہ اس شعر سے پہلے اس کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں ہوتا ورنہ اس شعر کو ہم سند ہی قرار دینے کی کیوں زحمت محسوس کرتے، تو کیا اس تصور کو حقیقت قرار دے کر کہ اس کے پہلے یہ لفظ کہیں نہیں ہے، ہم اس شعر کا انکار کر دیں گے یا صحیح طریقہ یہ ہوگا اور یہی اصول معمول بہ ہے کہ اس شعر میں اس لفظ کے وجود سے خود ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لفظ کا زبان عرب میں یہ رواج تھا، اسی طرح ہم آخر لفظ سلطان میں یہ اصول کیوں اختیار کرتے ہیں کہ ہم اپنے اس مزعومہ کو وحی منزل قرار دیں کہ یہ لفظ حادث ہے اور کلام عرب میں موجود نہ تھا خود جناب امیر علیہ السلام کے کلام اس کا وارد ہونا اس کا ثبوت کیوں نہ ہو کہ یہ لفظ چاہے عام اکثریت کی زبان پر جاری نہ ہو، لیکن وہ کلیۃً مفقود نہیں تھی اور اس کا شاہد یہی کلام امیر المومنین علیہ السلام کیوں قرار نہ پائے؟ پھر السلطان کا لفظی طور پر بمعنی ملک قرار دینے کی ضرورت ہے جبکہ وہ بمعنی مصدری یعنی حکومت واقتدار اور غلبہ یقینی موجود تھا اور قرآن مجید میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں ذریعہ غلبہ ہونے ہی کی بنا پر دلیل

کو سلطان کہا گیا ہے جس طرح اسی اعتبار سے اس کو حجت کہا جاتا ہے اور یہی معنی مصدری بعد میں اسمی شکل اختیار کر کے بمعنی ملک ہو گئے ہیں تو اس میں کیا دشواری ہے کہ

اذا تغیر السلطان تغیر الزمان

میں ہم السلطان کو حاکم کے معنی میں نہیں بلکہ حکومت واقتدار کے معنی میں لیں، جو ہماری زبان میں بھی بمعنی حاکم برابر رائج ہے لفظی طور پر یہ معنی نہ کہیں کہ جب بادشاہ بدلتا ہے تو زمانہ بدل جاتا ہے، بلکہ یہ معنی کہیں کہ جب اقتدار بدلتا ہے تو زمانہ میں بھی تغیر ہو جاتا ہے، نتیجہ وہی ایک ہے مگر وہ ہمارا مزعومہ بھی اگر ہمیں بہت عزیز ہو تو اس صورت میں محفوظ رہتا ہے۔ غرض یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں، جو کسی اصول روایت و درایت پر منطبق نہیں ہوتیں۔

خلفاء کے بارے میں نہج البلاغہ میں ہرگز کوئی ایسی سخت بات نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں موجود نہ ہو اور جناب امیر علیہ السلام کے ان رجحانات کے مطابق نہ ہو جو مسلم الثبوت حیثیت سے دوسری کتب اہل سنت میں بھی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اس قسم کے الفاظ کا حضرت کی زبان پر آنا تو اس کا ثبوت ہے کہ وہ آپ کا کلام ہے۔ ہاں اگر آپ کے واقعی رجحانات کے خلاف اس میں الفاظ ملتے تو اس پر تو غور کرنے کی بھی ضرورت ہوتی کہ وہ کس بنا پر ہیں یا انہیں کسی مجبوری کا نتیجہ قرار دینا پڑتا جیسے بعض علماء کے خیال کے مطابق للہ بلاء فلان والا خطبہ یہی نوعیت رکھتا ہے مگر وہ کلام جو اپنے متکلم کے خیالات کا نمایاں طور پر آئینہ بردار ہو اسے تو کسی حیثیت سے اس متکلم کی طرف نسبت صحیح ماننے میں تامل کا کوئی سبب ہی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ باوجود ابن خلکان کے اس اظہار تذبذب اور ذہبی کے اس جسارت انکار کے پھر بھی منصف مزاج اور حقیقت پسند علماء و محققین بلا تفریق مذہب و ملت نہج البلاغہ کے مندرجات کو کلام امیر المومنین علیہ السلام مانتے رہے اور اس کا اظہار کرتے رہے جن میں سے کچھ افراد کا جو سر دست پیش رہیں ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ا۔ علامہ شیخ کمال الدین محمد ابن طلحہ قریشی شافعی متوفی ۶۵۲ھ اپنی کتاب مطالب السؤل فی مناقب آل الرسول میں جو لکھنو میں بھی طبع ہوچکی ہے۔علوم امیر المومنین علیہ السلام کے بیان میں لکھتے ہیں:

ورابعها علم البلاغه والفصاحة وكان فيها امام لا يشق غباره و مقدما لا تلحق اثاره ومن وقف عمى كلامه المرقوم الموسوم بنهج البلاغة صار الخبر عنده عن فصاحته عيانا والظن بعلم مقامه فيه ايقانا۔

چوتھے علم فصاحت و بلاغت آپ اس میں امام کا درجہ رکھتے تھے جن کے گرد قدم تک بھی پہنچنا ناممکن ہے اور ایسے پیشرو تھے، جن کے نشان قدم کا مقابلہ نہیں ہوسکتا اور جو حضرت کے اس کلام پر مطلع ہو جو نہج البلاغہ کے نام سے موجود ہے اس کے لئے آپ کی فصاحت کی سماعی خبر مشاہدہ بن جاتی ہے اور آپ کی بلندی مرتبہ کا اس باب میں گمان یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

النوع الخامس فی الخطب والمواعظ مما نقلته الرواة وروته الثقات عنه عليه السلام قد اشتمل كتاب نهج البلاغه المنسوب اليه على انواع من خطبه ومواعظه الصادعة باوامر ها و نواهيها المطلة انوار الفصاحة والبلاغة مشرقة من الفاظها و معانيها الجامعة حكم عيون علم المعانى ولابيان على اختلاف اساليها

پانچویں قسم ان خطب اور مواعظ کی شکل میں ہے، جس کو راویوں نے بیان کیا ہے اور ثقات نے حضرت سے ان کو نقل کیا ہے اور نہج البلاغہ کتاب جس کی نسبت حضرت یک طرف دی جاتی ہے وہ آپ کے مختلف قسم کے خطبوں اور موعظوں پر مشتمل ہے جو اپنے اوامر ونواہی کو مکمل طور پر ظاہر کرتے اور فصاحت و بلاغت کے انوار کو اپنے الفاظ و معانی سے تابندہ شکل میں نمودار کرتے اور فن معانی و بیان کے اصول اور اسرار کو اپنے مختلف انداز بیان میں ہمہ گیر صورت سے ظاہر کرتے ہیں۔

اس میں مندرجات نہج البلاغہ کو معتبر و ثقہ راویوں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یقینی طور پر کلام امیر المومنین علیہ السلام تسلیم کیا ہے ایک جگہ جو منسوب کی لفظ ہے، اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہئے، وہ بحیثیت مجموعی کتاب بشکل کتاب سے متعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب امیر المومنین علیہ السلام کی جمع کردہ نہیں ہے۔ کتاب، تو حقیقتاً سید رضی ہی کی ہے مگر عوام مجازی طور پر یا ناواقفیت کی نبا پر یونہی کہتے ہیں کہ یہ امیر المومنین کی کتاب ہے یہ نسبت اس کلام کے لحاظ سے دی جاتی ہے جو اس کتاب میں درج ہے اور اسی لئے اس محل پر علامہ ابن طلحہ نے منسوب کی لفظ صرف کی ہے جو بالکل درست ہے اس سے اصل کلام کے بارے میں ان کے وثوق واطمینان کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔

۲۔ علامہ ابوحامد عبدالحمید ابن ہبۃ اللہ المعروف بابن ابی الحدید مدائنی بغدادی متوفی ۶۵۵ ھ جنہوں نے اس کتاب کی مبسوط شرح لکھی ہے وہ حضرت امیر علیہ السلام کے فضائل ذاتیہ میں فصاحت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اما الفصاحة فهو امام الفصحاء و سيد البلغاء وعن كلامه قيل دون كلام الخالق و فوق كلام المخلوقين ومنه تعلم الناس الخطابة والكتابة۔

فصاحت کی آپ کا یہ عالم ہے کہ آپ فصحا کے امام اور اہل بلاغت کے سرگروہ ہیں، آپ ہی کے کلام کے متعلق یہ مقولہ ہے کہ وہ خالق کے کلام کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے اور آپ ہی سے دنیا نے خطابت و بلاغت کے فن کو سیکھا۔

اس کے بعد عبد الحمید بن یحییٰ اور ابن نباتہ کے وہ اقوال درج کئے گئے ہیں، جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں پھر لکھا ہے:

ولما قال محقن ابن ابی محقن لمعاوية جئتك من عند اعيى الناس قال له و يحك كيف يكون اعيى الناس فوالله ماسن الفصاحة لقريش غيره و يكفى هذا الكتاب الذى نحن شارحوه دلالة على انه لا يجارى فى الفصاحة ولا يبارى فى البلاغة

اور جب محقن بن ابی محقن نے (خوشامد میں) معاویہ سے کہا کہ میں سب سے زیادہ گنگ شخص کے پاس سے آیا ہوں معاویہ نے کہا کہ وائے ہوتم پر وہ گنگ کیونکر کہے جا سکتے ہیں حالانکہ خدا کی قسم فصاحت کا راستہ قریش کو سوا ان کے کسی اور نے نہیں دکھایا ہے اور یہی کتاب جس کی ہم شرح لکھ رہے ہیں اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ حضرت فصاحت میں وہ بلند درجہ رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا اور بلاغت میں آپ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ مذکور دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

ابن كثيرا من فصوله داخل فى باب المعجزات المحمدية الاشتمالها على الاخبار الغيبية و

خروجها من وسع الطبيعة البشرية۔

اس کتاب کے اکثر مقامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا معجزہ کہے جاسکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ غیبی خبروں پر مشتمل ہیں اور انسانی طاقت کے حدود سے باہر ہیں۔

حالانکہ علامہ ابن ابی الحدید اپنے معتقدات میں جو شیعت کے خلاف ہیں پورے راسخ ہیں اور اس لئے نہج البلاغہ میں جہاں جہاں ان کے معتقدات کے خلاف چیزیں ہیں ان کو کافی زحمت درپیش ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی وہ اس شک وشبہ کا اظہار نہیں کرتے کہ یہ شاید امیر المومنین علیہ السلام کا کلام نہ ہو، بلکہ خطبہ شقشقیہ تک میں جو سب سے زیادہ ان کے جذبات کے خلاف مضامین پر مشتمل ہے وہ اس امر کو بقوت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام اور اس کے خلاف ہر تصور کو دلائل کے ساتھ رد کردیتے ہیں

انہوں نے خطبہ ہی میں قدم المفضول علی الفاضل خدا نے (معاذ اللہ) کسی مصلحت سے غیر افضل کو افضل پر مقدم کردیا اور اسی طرح خطبہ شقشقیہ وغیرہ کے تشریحات میں انہوں نے اپنے معتقدات کا اظہار کردیا ہے اور امیر المومنین کے الفاظ کو معاذ اللہ آپ کے بشری جذبات کا تقاضہ قرار دیا ہے

یہ امور اس تصور کو ختم کردیتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں اس شیعہ رئیس کی خوشامد مدنظر رکھی ہے جس کے نام پر انہوں نے یہ شرح معنون کی تھی۔ ابن العلقی شیعہ ضرور تھے، مگر وہ سلطنت بنی عباس کے وزیر تھے اور یہ کتاب دولتِ عباسیہ کے سقوط سے پہلے ان کے دور وزارت میں لکھی گئی ہے۔

اول اگر خوشامد مدنظر ہوتی تو وزیر کے بجائے خود خلیفہ وقت کے جذبات کا لحاظ کرنا زیادہ ضروری ہوتا۔

دوسرے ظاہر ہے کہ سلطنت عباسیہ کے وزیر ہونے کی بنا پر خود ابنِ العلقمی بھی

کھل کر ایسے شخص کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے جو حکومت وقت کے مذہب کے موافق کوئی بات کہے نہ وہ خود ہی ایسے جذبات کا علانیہ اظہار کرتے تھے

پھر اگر ان کی خوشامد ہی پیش نظر ہوتی تو ابن ابی الحدید اسی کتاب میں شیعت کی رد کیوں کرتے اور خلافتِ ثلاثہ کو شروع سے لے کر آخر تک بقدر امکان مضبوط کرنے کی کوشش کس لئے کرتے۔ ان کا یہ نظریہ طرز عمل صاف بتا رہا ہے کو انہوں نے کتاب میں اپنے حقیقی خیالات اور جذبات کو برابر پیش نظر رکھا ہے وہ اگر نہج البلاغہ کی صحت میں ذرا سا شک وشبہ کا بھی اظہار کر دیتے تو وہ اس سے زیادہ ابن العلقمی کے لئے تکلیف دہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جتنا خدا کی طرف اس غلط کام کو منسوب کرنا کہ وہ مفضول کو فاضل کو ترجیح دے دیتا ہے یا امیر المومنین علیہ السلام کے اقوال کو معاذ اللہ نفسانیت پر محمول کرنا جو خطبہ شقشقیہ وغیرہ کی شرح میں انہوں نے لکھ ڈالا ہے بلکہ ایک شیعہ کے لئے ان الفاظ کے کلام امیر المومنین علیہ السلام ہونے سے انکار کر دینا اتنا صدمہ نہیں پہنچا سکتا اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی اتنی بڑی توہین نہیں ہے جتنا یہ تصور کرنا کہ حضرت نے معا ذ اللہ حقیقت کے خلاف صرف اپنی ذاتی رنجش کے بنا پر یہ الفاظ فرما دیئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہرگز ابن ابی الحدید کو ابن العلقمی کی کوئی خاطر داری اظہار خیالات میں پیش نظر نہ تھی اور اس کتاب پر ابن العلقمی نے اگر کوئی انعام دیا ہو تو یہ صرف ان کے وسعت صدر اور وسعت نظر اور تحمل کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ایک مخالف مذہب کے ایک علمی کارنامے کی صرف علمی کارنامہ ہونے کی بنا پر قدر کی جو کہ ان کے خود عقائد و خیالات سے متضاد مضامین پر بھی مشتمل تھا۔

میرے خیال میں تو ابن ابی الحدید نے اپنے عقیدہ کو اس کتاب میں اتنا ضرورت سے زیادہ طشت از بام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت کا تصور بھی پیدا ہونا غلط ہے۔

۳۔ ابو السعادات مبارک مجد الدین ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے اپنے

مشہور کتاب نہایہ میں جواحادیث و آثار کے لغات کی شرح کے موضوع پر ہے کثیر التعداد مقامات پر نہج البلاغہ کے الفاظ کوحل کیا ہے۔ابن اثیر کی حیثیت فقط ایک عام لغوی کی نہیں ہے بلکہ وہ محدث بھی ہیں اگرصرف ادبی اہمیت کے لحاظ سے ان کوان الفاظ کا حل کرنا ہی ضروری تھا تو وہ اس کونہج البلاغہ کا نام لکھ کر درج کرتے، پھر واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اس کو وہ کلام امیر المومنین علیہ السلام سمجھتے ہی نہ تو انہیں اس کتاب میں جوصرف احادیث اور آثار کےحل کے لئے لکھی گئی ہے، ان لغات کو جگہ نہ دینا چاہئے تھی، کیونکہ (اثر کی تعریف):اصطلاحی طور پر اثر صرف صحابہ اورممتاز تابعین کی زبان سے نکلے ہوئے اقوال کو کہتے ہیں

کسی متاخر عالم کی کتاب کے الفاظ نہ حدیث میں داخل ہیں اور نہ اثر میں ۔ ان کا ان الفاظ کو جگہ ہی دینا اس کا ثبوت ہے کہ وہ اس کو سید رضی کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ کلام امیر المومنین علیہ السلام قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان لغات کو درج کرنے میں ہر مقام پر تصریحاً حدیث علیعلیہ السلام کا لفظ کا استعمال کرتے ہیں، جیسے لغت جوئی میں

منه حديثا علي يونهي فتق الاجواء وشق الارجاء

میں زیادہ تر ان الفاظ کا تذکرہ حدیث علی علیہ السلام کی لفظوں کے ساتھ ہے اور کہیں پر خطبہ علی علیہ السلام ہے، جیسے لغت لوط میں

في خطبة علي ولاطها بالبلة حتي لزبت

ایک جگہ لغت میں یہ الفاظ ہیں:

كلام علي مات قيها وطال تايمها۔

اسی طرح لغت اصل میں فی کلام علی علیہ السلام کے الفاظ ہیں اور ایسے ہی دوایک جگہ اور باقی تمام مقامات کو استقصا کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب "نہج البلاغہ کا استناد" میں درج کیا ہے جو امامیہ مشن لکھنو سے شائع ہوئی ہے۔

۴۔علامہ سعدالدین تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ شرح مقاصد میں لکھتے ہیں

واذا هو افصحلهم لساناً علی مایشهد به کتاب نهج البلاغه۔

حضرت سب سے زیادہ فصیح اللسان بھی تھے، جس کی گواہی کتاب نہج البلاغہ دے رہی ہے۔

۵۔ جمال الدین ابوالفضل محمد بن مکرم بن علی افریقی مصری متوفی ۷۱۱ھ انہوں نے بھی نہایہ کی طرح اپنی عظیم الشان کتاب لسان العرب میں مندرجہ الفاظ کو کلام علی علیہ السلام کہتے ہوئے حل کیا ہے۔

۶۔ علامہ علاء الدین قوشجی متوفی ۸۷۵ھ شرح تجرید میں قول محقق طوسی افصحهم لساناً کی شرح میں لکھتے ہیں:

ما یشهد به کتاب نهج البلاغه و قال البلغاء ان کلامه دون کلام الخالق وفوق کلام المخلوق

کی شاہد ہے۔آپ کی کتاب نہج البلاغہ کا قول ہے کہ آپ کا کلام خالق کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے۔

۷۔ محمد بن علی بن طباطبائی معروف بہ ابن طقطقی اپنی کتاب تاریخ الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، مطبوعہ مصر ۹ میں لکھتے ہیں:

عدل ناس الی نهج البلاغه من کلام امیر المومنین علی ابن ابی طالب فانه الکتاب الذی یتعلم منه الحکم والمواعظ والخطب والتوحید والشجاعة والزهد وعلو الهمّة وادنی فوائده الفصاحة والبلاغه

بہت سے لوگوں نے کتاب نہج البلاغہ کی طرف توجہ کی جو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہے۔ کیونکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جسے حکم اور مواعظہ اور توحید اور زہد اور علو ہمت،

ان تمام باتوں کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اور اس کا سب سے ادنی فیض فصاحت و بلاغت ہے۔

۸۔علامہ محدث ملا طاہر فتنی گجراتی ،انہوں نے بھی مجمع بحارالانوار، نہایہ کی طرح احادیث و آثار کے لغات ہی کی شرح میں لکھی ہے اور انہوں نے بھی الفاظ نہج البلاغہ کو کلام امیر المومنین تسلیم کرتے ہوئے ان کی شرح کی ہے۔

۹۔علامہ احمد بن منصور کازرونی اپنی کتاب مفتاح الفتوح میں امیر المومنین کے حالات میں لکھتے ہیں:

ومن تأمل فی کلامه و کتبه و خطبه و رسالانه علم ان علمه لایوازی علم احد و فضائله لا تشاکل فضائل احد بعد محمد صلی الله علیه و سلم ومن جملتها کتاب نهج البلاغه۔

جو حضرت کے کلام اور خطوط او رخطبوں اور تحریروں پر غور کی نگاہ ڈالے اسے معلوم ہوگا کہ حضرت کا علم کسی دوسرے کے علم کی طرح اور حضرت کے فضائل پیغمبر کے بعد کسی دوسرے کے فضائل کے قبیل سے نہیں تھے۔(یعنی بدر جہازیادہ تھے)اور انہیں میں سے کتاب نہج البلاغہ ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنف کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ حضرت کلام کا ذخیرہ نہج البلاغہ کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ موجود ہے اور یہ صرف اس کا ایک جز ہے۔

والله لقد وقف دونه فصاحة الفحا وبلاغة البلغاء و حکمة الحکاء۔

اور خدا کی قسم آپ کی فصاحت کے سامنے تمام فصحا کی

فصاحت اور بلیغوں کی بلاغت اور حکماء روزگار کی حکمت مفلوج ومعطل ہوکر رہ جاتی ہے۔

۱۰۔ علامہ یعقوب لاہوری شرح تہذیب الکلام میں افصح کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومن ازاد مشاهدة بلاغته ومسامعة فصاحته فليظر الى نهج البلاغه ولا ينبيغى ان ينسب هذا الكلام البليغ الى رجل شيعى۔

جوشخص آپ کی فصاحت کو دیکھنا اور آپ کی بلاغت کو سننا چاہتا ہو، وہ نہج البلاغہ پر نظر کرے اور ایسے فصیح وبلیغ کلام کو کسی شیعہ عالم کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔

۱۱۔علامہ شیخ احمد ابن مصطفی معروف بہ طاشکیری زادہ اپنی کتاب شقائق نعمانیہ فی علماء دولۃ عثمانیہ قاضی قوام الدین یوسف کی تصانیف کی فہرست میں لکھتے ہیں:

وشرح نہج البلاغہ اللامام الہامام علی بن ابی طالب کرم اللہ تعالی وجہہ۔

۱۲۔ مفتی دیار مصریہ علامہ شیخ محمد بعدہ متوفی ۱۳۲۳ھ جن کی اس سعی جمیل کے مشکور ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مصر اور بیروت وغیرہ اہل سنت کے علمی مرکز وں کو نہج البلاغہ کے فیوض سے بہرہ مند بنانے کا سامان کیا اور وہاں کے باشندوں کو ان کے سبب سے اس جلیل القدر کتاب کا تعارف ہوسکا۔ انہوں نے نہج البلاغہ کو اپنے تفسیری حواشی کے ساتھ مصر میں چھپوایا۔جس کے بہت ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں وہ اپنے اس مقدمہ میں جو شروع کتابت میں درج کیا ہے، اپنی اس دہشت وحیرت کا اظہار کرتے ہوئے جو نہج البلاغہ کے حقائق آ گیں عبارات سے ان پر طاری ہوئی ہے، تحریر کرتے ہیں:

كان يخيل الى فى كل مقام ان حروباشبت و غارات

شنت وان للبلاغة دولة وللفصاحة صولة وان
الاوهام عرامة وللريب دعارة وان جحافل الخطابة و
كتائب الذرابة فی عقود النظام و صفوف الانتظام
تنافح بالصفيح الا بلبج والقويم الاملج وتمثلج
المهج بروائع الحجج فتفل من دعارة الوساوس
وتصيب مقاتل الخوانس فما انا الا ولاحق متنصر
والباطل منكسر و مروج الشك فی خمود وهرج
الريب فی ركود وان مدبر تلك الدولة و باسل تلك
الصولة هو حامل لوائها الغالب امير المومنين علی
ابن ابی طالب بل كنت كلما انتقلت من موضع الی
موضع احس بتغير المشاهد وتحول المعاهد فتارة
كنت اجدنی فی عالم يعمره من المعانی ارواح عاليه
فی حلل من العبارات الزاهية نظرف علی النفوس
الزاكية وقدنومن القلوب اصافية توحی اليها
رشاردها وتقوم منها منادها و تنفربها عن
مداحض المزال الی جواد الفضل ولكمال وطور
اكانت تنكشف لی الجمل عن وجوه باسره وانياب
كاشرح وارواح فی اشباح النمور و مخالب النسور
قد نحفزت للوثاب ثم النقضت للاختلاب فخلب
القلوب عن هواها و اخذت الخواطر دون
مرماها واغتالت فاسد الاهواء وباطل الاراء
واحيانا كنت اشهد ان عقلا نورانيا لايشبه خلقا

جسدانیا فصل عن الموکب الالٰھی واتصل بالروح الانسانی فخلعه عن غاشیات الطبیعة و سمابه الی الملکوت الاعلی ونمابه الی مشهد النور الاجلی و سکن به الی عمار جانب التقدیس بعد استخلاصه من شوائب التلبیس و انات کانی اسمع خطیب الحکمة ینادی با علیاء الکلمة واولیاء ا مر الامة یعرفهم مواقع الصواب و یبصرهم مواضح الارتیاب و یحذرهم مزلق الاضطراب ویرشدهم الی دقائق السیاسة و یهدیهم طرق الکیاسة ویرتفع بهم الی مناضات الریاسة و یصعدهم شرف التدبیر و یشرف بهم علی حسن المصیر۔

"ہر مقام پر(اس کے اثنائے مطالعہ میں) مجھے ایسا تصور ہورہا تھا کہ جیسے لڑائیاں چھڑی ہوئی ہیں۔ نبرد آزمائیاں ہورہی ہیں۔ بلاغت کا زور ہے اور فصاحت پوری قوت سے حملہ آور ہے۔ توہمات شکست کھارہے ہیں شکوک وشبہات پیچھے ہٹ رہے ہیں خطابت کے لشکر صف بستہ ہیں۔ طلاقت لسان کی فوجیں شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں مصروف ہیں، وسوسوں کا خون بہایا جارہا ہے اور توہمات کی لاشیں گررہی ہیں اور ایک دفعہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس حق غالب آگیا اور باطل کی شکست ہوگئی اور شک وشبہ کی آگ بجھ گئی اور تصورات باطل کا زور ختم ہوگیا اور اس فتح ونصرت کا سہرا اس کے علمبردار اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سر ہے۔ بلکہ اس کتاب کے مطالعہ میں جتنا جتنا میں ایک جگہ سے

دوسری جگہ منتقل ہوا میں نے مناظرہ کی تبدیلی اور مواقف کے تغیر کو محسوس کیا کبھی میں اپنے کو ایسے عالم میں پاتا تھا جہاں معانی کی بلند روحیں خوشنما عبارتوں کے جامے پہنے ہوئے پاکیزہ نفوس کے گرد چکر لگاتی اور صاف دلوں کو نزدیک آکر انہیں سیدھے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتی اور نفسانی خواہشوں کا قلع قمع کرتی اور لغزش مقامات متنفر بنا کر فضیلت و کمال کے راستوں کا سالک بناتی ہیں اور کبھی ایسے جملے سامنے آجاتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ تیوریاں چڑھائے ہوئے اور دانت نکالے ہوئے ہولناک شکلوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اور ایسی روحیں ہیں جو چیتوں کے پیکروں میں اور شکاری پرندوں میں پنجوں کے ساتھ حملہ پر آمادہ ہیں اور ایک دم شکار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دلوں کو ان کے ہوا و ہوس کے مرکزوں سے جھپٹ کر لے جاتے ہیں اور ضمیروں کو پست جذبات سے زبر دستی علیحدہ کر دیتے اور غلط خواہشوں اور باطل عقیدوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں اور بعض اوقات میں جیسے مشاہدہ کرتا تھا کہ ایک نورانی عقل جو جسمانی مخلوق سے کسی حیثیت سے بھی مشابہ نہیں ہے خداوندی بارگاہ سے الگ ہوئی اور انسانی روح سے متصل ہو کر اسے طبیعت کے پردوں سے اور مادیت کے حجابوں سے نکال لیا اور اسے عالم ملکوت تک پہنچا دیا اور تجلیات ربانی کے مرکز تک بلند کر دیا اور لے جا کر عالم قدس میں اس کو ساکن بنا دیا اور بعض لمحات میں معلوم ہوتا تھا کہ حکمت کا خطیب صاحبان اقتدار اور قوم کے اہل حل وعقد کو للکار رہا ہے اور انہیں صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دے رہا ہے اور ان کی غلطیوں پر متنبہ کر رہا ہے اور انہیں سیاست

کی باریکیاں اور تدبر وحکمت کے دقیق نکتے سمجھا رہا ہے اور ان کی
صلاحیتوں کو حکومت کے منصب اور تدبر و سیاست کی اہلیت پیدا
کر کے مکمل بنا رہا ہے۔

اس میں علامہ محمد عبدہ نے جس طرح یقینی طور پر اس کو کلام امیر المومنین علیہ السلام تسلیم کیا ہے اسی طرح اس کے مضامین کی حقانیت اور اس کے مندرجات کی سچائی کا بھی اعتراف کیا ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب کے مضامین حق کی فتح اور باطل کی شکست اور شکوک واوہام کی فنا اور توہمات ووسواس کی بیخ کنی کا سبب ہیں اور وہ شروع سے آخر تک انسانی روح کے لئے روحانیت وطہارت اور جلال وکمال کی تعلیمات کی حامل ہیں۔

علامہ محمد عبدہ کو نہج البلاغہ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے قرآن مجید کے بعد ہر کتاب کے مقابلہ میں ترجیح کا مستحق سمجھتے تھے اور انہوں نے اپنا یہ اعتقاد بتایا ہے کہ جامعۂ اسلامیہ میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت ہے اور یہ صرف اس لئے کہ وہ امیر المومنین علیہ السلام ایسے بلند مرتبہ مصلح عالم کا کلام ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

لیس فی اهل هذه اللغة الاقائل بان کلام الامام
علی بن ابی طالب هو اشرف الکلام وابلغ۔ بعد کلام
الله تعالیٰ و کلام نبیة واغزره مادة وارفعه اسلوبا
واجمعه لجلائل المعانی فاجدر بالطالبین لنفائس
اللغة والطامعین فی التدرج لمراقیها ان یجعلوا هذا
الکتاب اهم محفوظهم وافضل ماثورهم مع تفهم
معانیه فی الاغراض التی جاء ت لاجلها و تأمل
الالفاظه فی المعانی التی صیغت للدلالة علیها

لیصیبوا بذالك افضل غایة وینتهوا الی خیر نهایة

اس عربی زبان والوں میں کوئی ایسا نہیں جو اس کا قائل نہ ہو کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام کلام خدا و کلامِ رسول کے بعد ہر کلام سے بلند تر زیادہ پر معانی اور زیادہ فوائد کا حامل ہے لہذا عربی کے نفس ذخیروں کے طلاب کے لئے یہ کتاب سب سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے اپنے محفوظات اور منقولات میں اہم درجہ پر رکھیں اور اس کے ساتھ ان معانی و مقاصد کے سمجھنے کی کوشش کریں، جو اس کتاب کے الفاظ میں مضمر ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ علامہ محمد عبدہ کی یہ کوشش پورے طور پر بارآور بھی ہوئی۔ ایسے تنگ نظر کے ماحول میں جبکہ علمی دنیا کا یہ افسوسناک رویہ ہے کہ خود اہل سنت کی وہ کتابیں جو اہل بیت معصومین سے یا حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے متعلق ہیں انہیں زیادہ تر ایران کے شیعی مطبعوں نے شائع کیا ہے مگر مصر و بیروت وغیرہ کے علمی مرکزوں نے انہیں کبھی قابل اشاعت نہ سمجھا۔ مثلا

سبط ابن جوزی کتب سیر میں پوری علمی جلالت سے یاد کئے گئے ہیں مگر ان کی کتاب تذکرہ صرف اس لئے سودِ اعظم کی بارگاہ میں درخور اعتنا نہیں سمجھی گئی کہ اس میں اہل بیت رسول ص کے حالات زیادہ ہیں اسی طرح حافظ نسائی کی خصائص وغیرہ۔

مگر نہج البلاغہ اپنے تمام مندرجات کے باوجود جن سے سواد اعظم کو اختلاف ہوسکتا ہے پھر بھی مصر اور بیروت کے علمی حلقوں میں پوری پوری مقبولیت اور مرکزیت رکھتی ہے اس کے مسلسل ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مدارس اور یونیورسٹیوں کے نصابوں میں داخل ہے یہ صرف ہندوستان یا پاکستان کی مناظرانہ ذہنیت اور اس کی مسموم فضا ہے کہ یہاں کے مدارس میں اکثر اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے جو خالص شیعی کتاب سے ہونا چاہئے علامہ شیخ محمد عبدہ نے نہ صرف اس کتاب پر حواشی لکھ دیئے اور اسے طبع

کر دیا بلکہ وہ اپنی گفتگوؤں میں برابر اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مجلّۃ الہلال مصر نے اپنی جلد نمبر ۳۵ کے شمارۂ اول بابت نومبر ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۸۷ پر چار سوالات علمی طبقہ کی توجہ کے لئے شائع کئے تھے۔ جن میں پہلا سوال یہ تھا کہ:

ماھوالکتاب اوالکتب التی طالعتموھا فی شبابکم فافادتکم واکان لھا اثر فی حیاتکم

وہ کونسی کتاب یا کتابیں ہیں، جن کا آپ نے دور شباب میں مطالعہ کیا تو انہوں نے آپ کو فائدہ پہنچایا اور ان کی زندگی پر اثر پڑا۔

اس سوال کا جواب استاد شیخ مصطفی عبدالرزاق نے دیا ہے، وہ شمارۂ دوم بابت دسمبر ۱۹۲۶ھ کے صفحہ ۱۵۰ پر شائع ہوا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

طالعت بارشاد الاستاذ المرحوم الشیخ محمد عبدہ دیوان الحماسۃ ونھج البلاغہ

میں نے استاد مرحوم شیخ محمد عبدہ کی ہدایت سے دیوان حماسہ اور نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا۔

''عبدالمسیح انطا کی'' نے ابھی جن کی رائے اس کے بعد آئے گی، اس کا ذکر کیا ہے علامہ محمد عبدہ نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ انشا پردازی کا درجہ حاصل کرو، تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اپنا استاد بناؤ اور ان کے کلام کو اپنے لئے چراغ ہدایت قرار دو۔

موصوف کا یہ عقیدہ نہج البلاغہ کے متعلق کہ وہ تمام و کمال امیر المومنین علیہ السلام کا کلام ہے، اتنا نمایاں تھا کہ ان کے تمام شاگرد جوان کے بعد سے اب تک مصر کے بلند پایہ اساتذہ میں رہے، اس حقیقت سے واقف تھے، چنانچہ استاد محمد محی الدین عبدالحمید مدرس کلیہ نعمت عربیہ جامعہ ازہر جن کے خود خیالات ان کی عبارت میں اس کے

بعد پیش ہوں گے، اپنے شائع کردہ ایڈیشن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

عسیت ان تسئال رای الاستاذ الامام الشیخ
محمد عبدہ فی ذٰلک ھو الذی بعث الکتاب من مرقدہ
ولم یکن احد اوسع منہ اطلاعاً ولا ادق تفکیر ا
والجواب علی ھذا تساؤل انا نعتقد انہ رحمہ اللہ کان
مقتنعاً بان الکتاب کلہ للامام علی رحمہ اللہ

ممکن ہے تم اس بارے میں استاد امام شیخ محمد عبدہ کی رائے دریافت کرنا چاہتے ہو جنہوں نے اس کتاب کو خوابِ گمنامی سے بیدار کیا اور ان سے بڑھ کر کوئی وسعتِ اطلاع اور باریکی نگاہ میں مانا بھی نہیں جاسکتا تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو تمام و کمال امیرالمومنین علیہ السلام کا کلام سمجھتے تھے۔

علامہ محمد عبدہ کا یہ مقدمہ جس کے اقتباسات ہم نے درج کئے ہیں، خود دنیائے ادبیت میں کافی اہمیت رکھتا ہے چنانچہ سید احمد ہاشمی نے اپنی کتاب جواہر الادب حصہ اول میں صفحہ ۳۱۷،۳۱۸ پر اسے تمام و کمال درج کر دیا ہے اور اس پر عنوان قائم کیا ہے وصف نہج البلاغہ للامام المرحوم الشیخ محمد عبدہ المتوفی ۱۳۲۲ھ۔

۱۳۔ ملک عرب کے مشہور مصنف، خطیب اور انشاء پرداز شیخ مصطفی غلائینی استاذ التفسیر والفقہ والاداب العربیہ فی الکلیہ الاسلامیہ بیروت، اپنی کتاب اریج الزہر میں زیرعنوان نہج البلاغۃ واسالیب الکلام العربی ایک مبسوط مقالہ کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:

من احسن ما ینبغی مطالعتہ لمن یتطلب الاسلوب
العالی کتاب نہج البلاغہ للامام علی رضی اللہ عنہ

وهو الكتاب الذى انشات هذا المقال لاجله فان فيه من بليغ الكلام ولاساليب المدهشة والمعانى الرائقة ومناحى الموضوعات الجليلة ما يجعل مطالعه اذ ازاوله مزاولة صحيحة بليغاً فى كتابته و خطابته ومعانيه

بہترین چیز جس کا مطالعہ بلند معیار ادبی کے طلب گاروں کو لازم ہے، وہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی کتاب نہج البلاغہ ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے لئے خاص طور پر یہ مقدمہ لکھا گیا ہے اس کتاب میں بلیغ کلام اور ششدر کردینے والے طرز بیان اور خوش نما مضامین اور مختلف عظیم الشان مطالب ایسے ہیں کہ مطالعہ کرنے والا اگر ان کی صحیح مزاولت کرے تو وہ اپنی انشا پردازی اپنی خطابت اور اپنی گفتگو میں بلاغت کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے کثیر التعداد افراد بلکہ اقوام نے استفادہ کیا ہے جن میں سے ایک کاتب الحروف ہے۔ میں ان تمام افراد کو جو عربی کے بلند اسلوبِ تحریر کے مطالب اور کلام بلیغ کے جویاں ہوں، اس کتاب کے حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

۱۴۔ استاد محمد کرد علی رئیس مجمع علمی دمشق نے الہلال کے چار سوالات کے جواب میں، جن میں سے تیسرا سوال یہ تھا کہ

ماهى الكتب تنصحون لشبان ليوم بقرأتها۔

وہ کونسی کتابیں ہیں جن کے پڑھنے کی موجودہ زمانہ کے نوجوانوں کو آپ ہدایت کرتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

اذا طلب البلاغة فی اتم مظاهرها والفصاحة التی لم تشبهها عجمة فعلیك بنهج البلاغه دیوان خطب امیر المومنین علی بان ابی طالب و رسائله الی عماله یرجع الی فصل الانشاء والمنشئین فی کتابی "القدیم والحدیث"

اگر بلاغت کا اس کے مکمل ترین مظاہرات کے ساتھ مشاہدہ مطلوب ہو اور اس فصاحت کو جس میں ذرہ بھر بھی زبان کی کوتاہی شامل نہیں ہے دیکھنا ہو تو تم کو نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، جو امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے خطب و مکاتب کا مجموعہ ہے تفصیل کے لئے ہماری کتاب "القدیم و الحدیث" مطبوعہ مصر ۱۹۲۵ء فصل الانشاء والمنشؤن دیکھنا چاہئے۔[1]

یہ جواب الہلال کی جلد نمبر پینتیس کے شمارہ نمبر ۵ بابت ماہ مارچ ۱۹۲۷ء میں صفحہ ۵۷۲ پر شائع ہوا ہے۔

۱۵۔استاد محمد محی الدین المدرس فی کلیۃ اللغۃ العربیۃ بالجامع الازہر جنہوں نے نہج البلاغہ پر تعلیقات تحریر کئے ہیں اور علامہ شیخ محمد عبدہ کے حواشی برقرار رکھتے ہوئے بہت سے تحقیقات و شرح کا اضافہ کیا ہے اور ان حواشی کے ساتھ یہ کتاب مطبع استقامۃ مصر میں طبع ہوئی ہے انہوں نے اس ایڈیشن کے شروع میں اپنی جانب سے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں نہج البلاغہ کے استناد و اعتبار پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ضروری اجزا یہاں درج کئے جاتے ہیں:

و بعد فهذا کتاب نهج ا لبلاغه وهو مااختاره

---

[1] (طبع مصر ۱۹۲۵)

الشریف الرضی ابو الحسن محمد بن الحسن الموسوی من کلام امیر المومنین علی ابن ابی طالب الذی جمع بین دفیته عیون البلاغة وفنونها و تهیأت به للناظر فیه اسباب الفصاحة ودنا منه قطانها اذکان من کلام افصح الخلق بعد الرسول صلی الله علیه وسلم منطقا واشدهم اقتدار اوابرعهم حجة واملکهم لغة یدیر ها کیف شاء الحکیم الذی تصدر الحکمة عن بیانه والخطیب الذی یملاء القلب سحر لسانه العالم الذی تهیاله من خلاط الرسول و کتابة الوحی ولکفاح عن الدین بسیفه لسانه منذحداثته ما لم یتهیا لاحد سواه هذا کتاب نهج البلاغه وانا به حفی منذ طرأة السن ومیعة الشباب فلقد کنت اجدوالدی کثیر القرأة فیه و کنت اجد عمی الاکبر یقضی معه طویل الساعات یردد عباراته و یستخرج معانیها و یتقبل اسلوبه وکان لهما من عظیم التاثیر علی نفسی ما جعلنی اقفو اثرهما فاحله من قلبی المحل الاول واجعله سمیری الذی لا یمل واینسی الذی اخلوالیه اذا عز الانیس

یہ کتاب نہج البلاغہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا وہ انتخاب ہے جو شریف رضی ابوالحسن محمد بن حسن موسوی نے کیا ہے یہ وہ کتاب ہے، جو اپنے دامن میں بلاغت کے نمایاں

جوہر اور فصاحت کے بہترین مرقعے رکھتی ہے اور ایسا ہونا ہی
چاہئے کیونکہ وہ ایسے شخص کا کلام ہے، جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد
تمام خلق میں سب سے زیادہ فصیح البیان سب سے زیادہ قدرتِ
کلام کا مالک اور قوت استدلال میں زیادہ اور الفاظ لغت عربی پر
سب سے زیادہ قابو رکھنے والا تھا کہ جس صورت سے چاہتا انہیں
گردش دے دیتا تھا اور وہ بلند مرتبہ حکیم جس کے بیان سے حکمت
کے سوتے پھوٹتے ہیں اور وہ خطی جس کے جادو بیانی دلوں کو
بھر دیتی ہے وہ عالم جس کے لئے پیغمبر خدا کے ساتھ انتہائی روابط
اور وحی کی کتابت اور دین کی نصرت میں شمشیر و زبان دونوں سے
جہاد کے ابتدائی عمر سے وہ مواقع حاصل ہوئے جو کسی دوسرے کو
ان کے سوا حاصل نہیں ہوئے یہ ہے کتاب نہج البلاغہ! اور میں اپنے
عنفوانِ شباب اور ابتدائے عمر ہی سے اس کا گرویدہ رہا ہوں،
کیونکہ میں اپنے والد کو دیکھتا تھا کہ وہ اکثر اس کتاب کو پڑھتے
تھے اور اپنے بڑے چچا کو بھی دیکھتا کہ وہ گھنٹوں پڑھتے رہتے اس
کے معانی کو سمجھتے رہتے اور اس کے انداز بیان پر غور کرتے رہتے
اور ان دونوں بزرگواروں کا میرے دل پر اتنا بڑا اثر تھا، جس نے
مجھے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا اور میں اس
کتاب کو اپنے قلب میں سب سے مقدم درجہ دے دیا اسے اپنا
مونس تنہائی قرار دیا جو ہمیشہ میرے لئے دل بستگی کا باعث ہے۔

اس کے بعد علامہ مذکور نے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے، جن کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسے شریف رضی کا خود کلام قرار دیتے ہیں ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں:

کہتے ہیں کہ کہ سب سے اہم اسباب جو اس کتاب کے کلام امیر المومنین علیہ السلام نہ ہونے سے متعلق پیش کئے جاتے ہیں، صرف چار ہیں۔

پہلے یہ کہ اس میں اصحاب رسول ﷺ کی نسبت ایسے تعریضات ہیں جن کا حضرت علی علیہ السلام سے صادق ہونا تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے، خصوصاً معاویہ، طلحہ، زبیر، عمرو بن عاص اور ان کے اتباع کے بارے میں سب وشتم تک موجود ہے۔

دوسرے اس میں لفظی آرائش اور عبارت میں صنعت گری اس حد پر ہے جو حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں مفقود تھی۔

تیسرے اس میں تشبیہات واستعارات اور واقعات ومناظر کی صورت کشی اتنی مکمل ہے جس کا پتہ صدر اسلام میں اور کہیں نہیں ملتا، اس کے ساتھ حکمت وفلسفہ کی اصطلاحیں اور مسائل کے بیان میں اعداد کا پیش کرنا یہ باتیں اس زمانہ میں رائج نہ تھیں۔

چوتھے اس کتاب کی اکثر عبارتوں سے علم غیب کے ادعا کا پتہ چلتا ہے، جو حضرت علی علیہ السلام ایسے پاکباز انسان کی شان سے بعید ہے۔

موصوف ان خیالات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خدا گواہ ہے کہ ہمیں ان اسباب میں سے کسی ایک میں اور ان سب مجموعی طور پر بھی کوئی واقعی دلیل، بلکہ اس کی مثل شکل بھی اس دعوے کے ثبوت میں نظر نہیں آتی جو ان لوگوں کا مدعا ہے، بلکہ انہیں تو ایسے شکوک وشبہات کا درجہ بھی نہیں دیا جاسکتا جو کسی حقیقت کے ماننے میں تھوڑا سا دغدغہ بھی پیدا کر سکتے ہوں اور جن کے رفع کرنے کی ضرورت ہو۔ پھر انہوں نے ایک ایک کر کے ہر بات کو رد بھی کیا ہے۔ پہلی بات کے متعلق جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کے بعد مسئلہ خلافت

میں طرز عمل ہی ایسا اختیار کیا گیا جس سے فطرتاً حضرت علی علیہ السلام کو شکایت ہونا ہی چاہئے تھی اور آپ کی خلافت کے دور میں اہل شام نے آپ کے خلاف جو بغاوت کی، اس سے آپ کو تکلیف ہونا ہی چاہئے ہر دور کے متعلق آپ کے جس طرح کے الفاظ ہیں وہ بالکل تاریخی حالات کے مطابق ہیں، اس لئے اس میں شک وشبہ کیا محل ہے۔

دوسرے اور تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا سا مرتبہ فصاحت اور حکمت دونوں میں کسی اور شخص کو حاصل نہیں تھا، تو پھر آپ کے کلام کی خصوصیات اس دور میں کسی اور کے یہاں مل ہی کیونکر سکتی ہیں، رہ گیا سجع وقافیہ کا التزام اس دور میں عموماً رائج تھا۔

چوتھی دلیل کے جواب میں علامہ مذکور نے جو کہا ہے وہ ہمارے مذہبی عقائد کے بے شک مطابق نہیں ہے مگر وہ خود ان کے نقطہ نظر کا حامل ہے وہ کہتے ہیں کہ جسے علم غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسے ہم فراست اور زمانہ کی نبض شناسی کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو علی علیہ السلام ایسے حکیم انسان سے بعید نہیں ہے۔

١٦۔ استاد شیخ محمد حسن نائل المرصفی نے بھی نہج البلاغہ کی ایک شرح لکھی ہے، جو دارالکتب العربیہ سے شائع ہوئی ہے، اس کے مقدمہ میں کلمۃ فی اللغۃ العربیہ کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

ولقد كان المجلّى فى هذا الحلبة على صلوات الله عليه
وما حسبنى احتاج فى اثبات هذا الى دليل اكثر من
نهج البلاغة ذالك الكتاب الذى اقامه الله حجة
واضحة على ان عليا رضى الله عنه قد كان احسن
مثال حى لنور القرآن وحكمته وعلمه وهدايته و
اعجازه و فصاحته اجتمع على فى هذا الكتاب مالم
يجتمع الكبار الحكماء و افذاذ الفلاسفة نوابغ

الربانیین من اٰیات الحکمۃ السامیۃ و قواعد السیاسۃ المستقیمۃ و من کل موعظۃ باھرۃ و حجۃ بالغۃ تشھد لہ بالفضل وحسن الاثر خاض علی فی ھذا الکتاب لجۃ العلم والسیاسۃ الدین فکان فی کل ھذہ المسائل نابغۃ مبرزا۔

اس میدان میں سب سے آگے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے اور اس دعویٰ کا سب سے بڑا ثبوت نہج البلاغہ ہے جسے اللہ نے ایک واضح حجت اس کی بنایا ہے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام قرآن کے نور اور حکمت اور علم اور ہدایت اور اعجاز اور فصاحت کی بہترین زندہ مثال تھے اس میں حضرت علی علیہ السلام کی زبان سے اتنی چیزیں یکجا ہیں، جو بڑے حکماء اور یکتائے زمانہ فلاسفہ اور شہرۂ آفاق علمائے ربانیین ان سب کی زبانی ملا کر بھی یکجا نہیں ملتیں۔ حکمت کی بلند نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد حیرت خیز موعظہ اور موثر استدلال اس کتاب میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے علم سیاست اور دین کے ہر دریا کی غواصی کی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ان میں سے ہر شعبہ میں یکتائے روزگار تھے۔

۱۷۔ استاد محمد الزہری الغمر اوی جنہوں نے مرصفی کی مذکور بالا شرح پر ایک مقدمہ تحریر کیا ہے اس میں طبقات الفصحاء کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

ولم ینقل عن احد من اھل ھذہ الطبقات ما نقل عن امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجھہ فقد اشتملت مقالاتہ علی المواعظ الزھدیۃ والمناحیّ السیاسیۃ والزواجر الدینیۃ والحکم

النفیسه والاداب الخلقیة والدرر التوحیدیة و الاشارات الغیبیة والردود علی الخصوم والنصائح علی وجه العموم واقد احتوی علی غرر کلامه کرم الله وجهه کتاب نهج البلاغة الذی جمعه وهذبه ابوالحسن محمد بن طاهر المشهور بالشریف الرضی رحمه الله واثابه وارضاه۔

ان تمام طبقات کے لوگوں میں سے کسی ایک سے بھی وہ کارنامہ نقل ہوکر ہم تک نہیں پہنچا، امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی زبانی پہنچا ہے آپ کے مقالات زاہدانہ مواعظ، سیاسی مسلک اور دین ہدایات، نفیس فلسفی بیانات، اخلاقی تعلیمات، توحیدی کے جواہر، غیبی اشارات مخالفین کی رووقدح اور عمومی نصائح پر مشتمل ہے اور آپ کے کلام کے روشن اقتباسات پر مشتمل کتاب نہج البلاغہ ہے جسے ابوالحسن محمد ابن طاہر مشہور بہ شریف رضی رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے۔

۱۸۔ الاستاذ عبدالوہاب حمودہ استاذ الادب الحدیث بکلیۃ الاداب جامعہ فواد اول مصر نے اپنے مقالہ الآراء الاجتماعیہ فی نہج البلاغۃ۔ میں جو رسالۃ الاسلام قاہرہ کے جلد ۳، عدد ۳ بابت ماہ رمضان ۱۳۷۰ھ مطابق جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے کہ:

وقد اجتمع له رضی الله عنه فی کتاب نهج البلاغه ما یجتمع لکبار الحکماء وافذاذ الفلاسفة ونوابغ الربانیین من آیات الحکمة السامیة، قواعد السیاسیة المستقیمة ومن کل موعظة باهرة، وحمة

بالغة وآراء اجتماعية، واسس حربية، مما يشهد
للامام بالفضل وحسن الاثر

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زبان سے کتاب نہج البلاغہ میں تن تنہا وہ تمام چیزیں اکٹھا ہوگئی ہیں جو اکابر علماء اور یکتائے روزگار فلاسفہ اور سر برآوردہ علمائے ربانیین سے مجموعی طور پر یکجا کی جاسکتی ہیں بلند حکمت کی نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد اور ہر طرح کا حیرت خیز موعظ اور موثر استدلال اور اجتماعی تصورات یہ سب امیرالمومنین علیہ السلام کی فضیلت اور بہترین کارگزاری کا بین گواہ ہیں۔

۱۹۔علامہ ابونصر پروفیسر بیروت یونیورسٹی نے اپنی کتاب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی فصل ۱۳ میں امیرالمومنین علیہ السلام کے آثار عربی میں نہج البلاغہ کا ذکر کیا ہے اور اس ذیل میں لکھا ہے کہ یہ کتاب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی عظیم شخصیت کی مظہر ہے۔

۲۰۔۔قاضی علی ابن محمد شوکانی صاحب نیل الاوطار نے اپنے کتاب "اتحاف الاکابر باسانید الدفاتر" طبع حیدرآباد (باب النون) میں نہج البلاغہ کے لئے اپنی سند متصل درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

نهج البلاغه من كلام على رضى الله عنه

نہج البلاغہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے، جس کا متعدد عیسائی محققین نے بھی اعتراف کیا ہے۔

۱)عبد المسیح انطاکی صاحب جریدہ "العمران" مصر، جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی سیرت میں اپنی مشہور کتاب "شرح قصیدہ علویہ" تحریر کی ہے اور وہ مطبع رعمسیس فجالہ مصر میں شائع ہوئی ہے وہ اس کے ص ۵۳۰، پر تحریر کرتے ہیں:

لاجدال ان سيدنا علياً امير المومنين هو امام
الفصحاء واستاذ البلغاء واعظم من خطب و كتب

فی حرف اهل هذه الصناعة الالباء وهذا کلام قد
قیل فیه بحق انه فوق کلام الخلق و تحت کلام الخالق
قال هذا کل من عرف فنون الکتابة واشتغل فی
صناعة التحبیر والتحریر بل هو استاذ کتاب
العرب ومعلمهم وبلا مرأ فما من ادیب لبیب
حاول اتقان صناعة التحریرا الادّبین یدیه القران
و نهج البلاغه ذلك کلام الخالق وهذا کلام اشرف
المخلوقین و علیهما یعوّل فی التحریر والتحبیر اذا
اراد ان یکون فی معاشر الکتبة المجیدین ولعل
اضل من خدم لغة قریش الشریف الرضی الذی
جمع خطب واقوال و حکم و رسائل سیدنا امیر
المومنین من افواه الناس واما لیهم واصاب کل
الاصابة باطلاقه علیه اسم "نهج البلاغه" وما
هذاالکتاب الاصراطها المستقیم لمن یحاول
الوصول الیها من معاشر المتادّبین۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ سیدنا حضرت علی امیر المومنین علیہ السلام فصیحوں کے امام اور بلیغوں کے استاد اور عربی زبان خطابت اور کتابت کرنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت ہیں اور یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہ کلام خلق سے بالا اور خالقِ کلام سے نیچے ہے یہ ہر اس شخص کا قول ہوگا، جس کے انشاء پردازی کے فنون سے واقفیت حاصل کی ہو اور تحریر کا مشغلہ رکھا ہو، بلکہ آپ بلاشبہ تمام عرب انشاء پردازوں کے

> استاد اور معلم ہیں کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو تحریر کے فن میں کمال حاصل کرنا چاہے، مگر یہ کہ اس کے سامنے قرآن ہوگا۔ اور نہج البلاغہ کہ ایک خالق کا کلام ہے اور دوسرا اشرف المخلوقین کا اور انہیں پر اعتماد کرے گا ہر وہ شخص جو چاہے گا کہ اچھے لکھنے والوں میں اس کا شمار ہو، غالباً زبان عربی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے بڑا درجہ شریف رضی کا ہے جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے یہ خطبے اور اقوال اور حکیمانہ ارشادات اور خطوط لوگوں کے محفوظات اور مخطوطات سے یکجا کئے ہیں اور انہوں نے اس کا نام "نہج البلاغہ" بھی بہت ٹھیک رکھا۔ بلاشبہ یہ بلاغت کا صراط مستقیم ہے ہر اس شخص کے لئے جو اس منزل تک پہنچنا چاہے۔

اس کے بعد انہوں نے شیخ محمد عبدہ کی رائے بیان کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ ابراہیم یازجی نے جو اس آخر دور میں متفقہ طور پر عربی کے کامل انشاء پرداز اور امام اساتذہ لغت مانے گئے ہیں، مجھ سے فرمایا مجھے اس فن میں جو مہارت حاصل ہوئی، وہ صرف قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے مطالعہ سے ہوئی ہے، یہ دونوں عربی زبان کے وہ خزانۂ عامرہ ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

۲) فواد افرام البستانی الآداب العربیہ فی کلیۃ القدیس یوسف (بیروت) انہوں نے ایک سلسلہ تعلیمی کتابوں کا روائع کے نام سے شروع کیا ہے، جس میں مختلف جلیل المرتبہ مصنفین کے آثار قلمی اور تصانیف سے مختصر انتخابات، مصنف کے حالات، کمالات، کتاب کی تاریخی تحقیقات وغیرہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی صورت میں ترتیب دیئے ہیں اور وہ کیتھولک عیسائی پریس (بیروت) میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلا مجموعہ امیر المومنین علیہ السلام اور نہج البلاغہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں مولف نے اپنے مقدمہ میں تحریر کیا ہے:

انا نبدا الیوم بنشر منتخبات من نهج البلاغه
للامام علی ابن ابی طالب اول مفکری الاسلام۔

ہم سب سے پہلے اس سلسلہ کی ابتدا کرتے ہیں کچھ انتخاباتِ
نہج البلاغہ کے ساتھ کے جو اسلام کے سب سے پہلے مفکر امام علی
ابن ابی طالب علیہ السلام کی کتاب ہے۔

اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوا ہے جو سلسلہ ٔروائع پہلی قسط ہے اس کا پہلا عنوان ہے۔''علی ابن ابی طالب'' علیہ السلام جس کے مختلف عناوین کے تحت امیر المومنین کی سیرت اور حضرت کی خصوصیات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک عیسائی کی تحریر ہوتے ہوئے پورے طور پر شیعی نقطہ نظر کے موافق نہ سہی لیکن پھر بھی حقیقت و انصاف کے بہت سے جوہر اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ دوسرا عنوان ہے''نہج البلاغہ اور اس کے ذیلی عناوین میں ایک عنوان ہے''جمعہ'' دوسرا عنوان ہے''صحۃ نسبتہ'' اس کے تحت میں لکھا ہے''نہج البلاغہ'' کے جمع و تالیف کو بہت زمانہ نہیں گزرا تھا کہ بعض اہل نظر اور مورّخین نے اس کی صحت میں شک کرنا شروع کیا، ان کا پیشرو ابن خلکان ہے، جس نے اس کتاب کو اس کے جامع کی طرف منسوب کیا ہے اور رپھر صفدی وغیرہ نے اس کی پیروی کی اور پھر شریف رضی کے بسا اوقات اپنے دادا مرتضیٰ کے لقب سے یاد کئے جانے کی وجہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو گیا اور وہ ان میں اور ان کے بھائی علی بن طاہر معروف بہ سید مرتضیٰ متولد ۹۶۶ء متوفی ۱۰۴۴ء میں تفرقہ نہ سمجھ سکے اور انہوں نے نہج البلاغہ کے جمع کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ جرجی زیدان نے کیا ہے اور لوگوں نے جیسے مستشرق کلیمان نے یہ طرہ کیا کہ اصل مصنف کتاب کا سید مرتضیٰ ہی کو قرار دے دیا ہم جب اس شک کے وجوہ واسباب پر غور کرتے ہیں تو وہ ہر پھر کے پانچ امر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے شک کے وہی اسباب تقریباً تحریر کئے ہیں جو اس کے پہلے محی الدین عبدالحمید شارح نہج البلاغہ کے بیان میں گزر چکے ہیں اور پھر انہوں نے ان

وجوہ کورد کیا ہے۔

بیروت کے شہرۂ آفاق مسیحی ادیب اور شاعر پولس سلامہ اپنی کتاب "اول ملحمہ عربیہ عید الغدیر" میں جو مطبعۃ النسر بیروت میں شائع ہوئی ہے۔ صفحہ ۷۱، ۷۲ پر لکھتے ہیں:

"نہج البلاغہ" مشہور ترین کتاب ہے، جس میں امام علی علیہ السلام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کتاب سے بالاتر سوا قرآن کے اور کسی کتاب کی بلاغت نظر نہیں آتی اس کے بعد حسب ذیل اشعار نہج البلاغہ میں کی مدح میں درج کئے گئے ہیں۔

هذه الكهف للمعارف باب

مشرع من مدينه الاسرار

تنثر الدر فى كتاب مبين

سفر نهج البلاغه المختار

هوروض من كل زهر جنى

اطلعته السماء فى النوار

فيه من نضرة الورد العذارى

والخزامى والفلّ والجلنار

فى صفاء الينبوع يجرى زلالا

كوثر ارائقاً بعيد القرار

تلمع الشط ولضفاف ولکن

بالعجز العیون فی الاغوار

یہ معارف وعلوم کا مرکز اور اسرار ورموز کا کھلا ہوا دروازہ ہے۔
یہ نہج البلاغہ کیا ہے، ایک روشن کتاب میں بکھرے ہوئے موتی
یہ چنے ہوئے پھولوں کا ایک باغ ہے، جس میں پھولوں کی لطافت چشموں کی صفائی اور آبِ کوثر کی شیرینی جس نہر کی وسعت اور کنارے تو آنکھوں سے نظر آتے ہیں مگر تہ تک نظریں پہنچنے سے قاصر ہیں۔

مذکورہ بالا ادباء محدثین کے کلام سے نہج البلاغہ کے لفظی اور معنوی اہمیت بھی ضمناً ثابت ہوگئی ہے اب اس کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا ہمارے فنی اصول سے اس کتاب کا وہ درجہ جس اعتبار سے ہم اس سے استدلال کر سکتے ہیں تو مجموعی طور پر ہمارے نزدیک اس کتاب کے مندرجات کی نسبت امیر المومنین کی جانب اسی حد تک ثابت ہے جیسے صحیفہ کاملہ کی نسبت امام زین العابدین کی جانب یا کتب اربعہ کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف یا معلقات اربعہ کی نسبت ان کے نظم کرنے والوں کی جانب رہ گیا، خصوصی عبارات اور الفاظ میں سے ہر ایک کی نسبت اطمینان وہ اسلوب کلام اور انداز بیان سے وابستہ ہے اور ان مندرجات کی مطابقت کے اعتبار سے ہے ان ماخذوں کے ساتھ جو صحیح طور پر ہمارے یہاں مسلّم الثبوت ہیں۔ اصطلاحی حیثیت سے قدما کی تعریف کے مطابق جو صحت خبر کے لئے وثوق بالصدور کو کافی سمجھتے ہیں ان شرائط کے بعد اس کا ہر جز صحیح کی تعریف میں داخل ہے اور متاخرین کی اصطلاح کی مطابق جو صحت کو باعتبار صفات راوی قرار دیتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے مندرجات کو مرسلات کی حیثیت حاصل ہے مرسلات کی اہمیت ارسال کرنے والے کی شخصیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ابن ابی عمیر اور جلیل القدر اصحاب

کے بارے میں علمانے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ ان تک جب خبر کی صحت ثابت ہوجائے تو پھر ان کے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کون راوی ہے اس لئے کہ ان کا نقل کرنا خوداس کے اعتبار کی دلیل ہے اوراسی لئے کہا گیا ہے کہ مرسلات ابن ابی عمیر حکم مسند میں ہیں۔ اس بنا پر خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہ کی جلالت قدر ضرور اسے عام مرسلات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ پھر بھی مواعظ وتواریخ وغیرہ کا ذکرنہیں جس میں عقیدہ وعمل ایسی اہمیت نہیں ہے۔لیکن مقام اعتقاد وعمل میں ہم نہج البلاغہ کے مندرجات وا ور ادلہ کے ساتھ جو اس باب میں موجود ہوں۔ اصول تعاون وتراجیح کے معیار پر جانچیں گے اور بعض موقعوں پر ممکن ہے جو مسند حدیث اس موضوع میں موجود ہو اس پر نہج البلاغہ کی روایت کوترجیح ہوجائے اور بعض مقاموں پر ممکن ہے تکافو ہوجائے اور بعض جگہ شاید ان دوسرے ادلہ کوترجیح ہوجائے ،لیکن اس سے نہج البلاغہ کی مجموعی حیثیت پر کوئی اثرنہیں پڑتا اس کا وزن اسی طرح برقرار رہتا ہے جس طرح کافی کی بعض حدیثوں کی کسی وجہ سے نظر انداز کرنے کے بعد بھی کافی کا وزن مسلم ہے۔

بہرصورت نہج البلاغہ کی علمی وادبی و مذہبی اہمیت اوراس کے حقائق آگیں مضامین اور اخلاقی مواعظ کا وزن نا قابل انکار ہے، مگر ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سے صحیح فائدہ وہی افراد اٹھا سکتے ہیں کہ جو عربی زبان میں مہارت رکھتے ہوں۔غیر عربی داں اس خزینۂ عامرہ سے فیض حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی لئے ایرانی فضلا وعلا کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اس کے فارسی ترجمے شائع کریں چنانچہ اس کے متعدد ترجمے ایران میں شائع ہوتے رہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔۔اردو زبان میں اس کے بعض ترجمے شائع ہوئے، ان میں سے کسی میں اغلاط بہت زیادہ تھیں اور کسی میں عبارت آرائی نے ترجمہ کے حدود کو باقی نہیں رکھا، نیز حواشی میں کبھی خالص مناظرانہ انداز کی بہتات ہوگئی اور کبھی اختصار کی شدت نے ضروری مطالب نظر انداز کر دیئے۔ جناب مولانا مفتی جعفر حسین صاحب جو ہندوستان و پاکستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اوراپنے علمی کمالات کے

ساتھ بلندئ سیرت اور سادگی معاشرت میں جن کی ذات ہندوستان و پاکستان میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے ان کی یہ کوشش نہایت قابل قدر ہے کہ انہوں نے اس کتاب کے مکمل ترجمہ اور شارحانہ حواشی کے تحریر کا بیڑا اٹھایا اور کافی محنت وعرق ریزی سے اس کام کی تکمیل فرمائی۔ بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب تک ہماری زبان میں اس کتاب کے جتنے تراجم اور حواشی شائع ہوئے ہیں ان سب میں جناب مفتی جعفر حسین کا ترجمہ اپنی صحت اور سلاست اور حسن اسلوب میں یقیناً بلند ہے اور حواشی میں بھی ضرور مطالب کے بیان میں کمی نہیں کی گئی اور زوائد کے درج کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ بلا شبہ نہج البلاغہ کے ضروری مندرجات اور اہم نکات پر مطلع کرنے کے لئے اس تالیف نے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس میں مصنف ممدوح قابل مبارکباد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبان ذوق ہر طبقہ کے اس کتاب کا ویسا ہی خیر مقدم کریں گے جس کی وہ مستحق ہے۔

جزی اللہ مولفہ فی الدارین خیرا۔

علی نقی النقوی

۴ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ